جلد ۱۰۲ نومبر ۱۹۸۴ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ

کا دفتر

اچھرہ سے تبدیل ہو گیا ہے۔

کرم فرماؤں سے گذارش ہے کہ دفتر سے ہر قسم کے رابطہ اور خط و کتابت کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع فرمائیں۔

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ

گنج بخش روڈ، دربار مارکیٹ نزد داتا دربار لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۲ | نومبر ۱۹۸۴ء مطابق صفر ۱۴۰۵ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(یہ تحریر جس اخلاص اور دردمندی سے لکھی گئی ہے، کاش کہ اُسی طرح کے ذہن سے اِسے پڑھا جائے) (ن۔ص)

آپ اگر کسی جزیرے میں رہتے ہوں اور زبردست طوفان یکایک اُٹھے جو سمندر کے پانی کو خشکی پر چڑھا لائے، یہاں تک کہ پانی کا بیس تیس فٹ اونچا ریلا آپ کی بستی کی طرف بڑھنے لگے تو کیا ایسی خوفناک گھڑی میں آپ میکدوں میں ساغر اچھالیں گے، کلبوں میں ڈانس کا انتظام کریں گے، کوٹھے کی چھت پر قمار بازی کے لیے پال جمائیں گے۔ اور خفیہ برآمد کے لیے ہیروئن کی پیکنگ کریں گے؟

اگر خدانخواستہ آپ کے محلے میں آگ بھڑک اُٹھے اور خود آپ کے بھی مکان کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے تو کیا ایسے میں آپ اپنے صحن میں سیاسی تصادم یا فرقہ وارانہ جھگڑوں کا دنگل جانا مناسب سمجھیں گے؟

اگر بستی میں مسلح ڈاکو باچھاپہ مار گھس آئیں اور فائر کر کر کے مردوں اور عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے ہوں اور وہ ایسی لوٹ مچائیں کہ چاروں طرف دہشت چھا رہی ہو تو کیا آپ یہ مناسب خیال فرمائیں گے دوڑنے بھاگنے والوں کی جیبیں رشوت کی قینچی سے کاٹی جائیں؟

کشتی اگر بھنور میں گھر کر ہچکولے کھانے لگے تو کیا موقع کے لحاظ سے صحیح رویہ یہ ہو گا کہ آپ ریڈیو یا ٹیلی وژن سے موسیقی کی دھنیں چھیڑ کر سر دھننے لگیں؟

خدانخواستہ آپ کے کارخانے کو آپ کے دشمنوں کا ایک جتھا آکر گھیر لے تو کیا یہ

قابلِ تصور رہے کہ آپ کے کارخانے کے اندر صوبائی تعصب کے چپڑوں سے افسر اور کارکن ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں لگ جائیں؟

آپ بر قائمیٔ ہوش و حواس متذکرہ صورتوں میں سے کسی کو بھی درست قرار نہیں دیں گے۔

اب ذرا اشاروں اور مثالوں کا پردہ ہٹا کر اپنی قومی و ملکی زندگی کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیجیے۔

ہمارے شمال مغربی جانب ایک سُپر پاور نے ہماری ایک برادر مُسلم قوم کی آزادی پہ اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں، لیکن عوام اس درندگی کے خلاف فوجی نظم، مؤثر اسلحہ اور رسد و مدد سے محروم ہونے کے باوجود معرکہ آرائی کا ایک ولولہ انگیز اور عبرت ناک باب تاریخِ انسانیت میں اپنے لہو کی روشنائی سے لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے گھروں کے ملبے اور اپنے باغوں اور فصلوں کی راکھ اور اپنی خون میں نہائی ہوئی لاشوں سے بارود، آگ اور زہریلی گیسوں کے سیلاب کے سامنے اب تک ناقابلِ شکست بند باندھے ہوئے ہیں۔ سُرخ سُپر پاور کی پوری تاریخِ استعمار میں پہلا موقع آیا ہے کہ ایک چھوٹی سی نہتی قوم نے چار سالہ مقاومت میں اسے ناکوں چنے ہی نہیں چبوا دیے، چٹانیں چبوا دی ہیں۔

مگر ہماری سرحد کے اُس طرف جو جہاد برپا ہے اور جو خون خرابہ ہو رہا ہے اُسے ہم نے نہ سنجیدگی سے غور کا مستحق سمجھا اور نہ اُس کے ممکناتِ مابعد کا کوئی تصور باندھا۔ ہم نے صرف افغانستان کے بلاکشوں کے کنبوں کو پاکستان میں پناہ دے کر (اور کبھی کچھ امدادی چندے اور کپڑے اور دوائیں دے کر) یہ سمجھ لیا کہ بس حکومت اور عوام پر جو فرض عاید ہوتا تھا وہ ادا ہو گیا۔ اِس میں بھی کچھ اختلافی سوچ رکھنے والوں اور کچھ روسی گماشتوں نے فی یہ نکال لی کہ مہاجرین بڑے خوش حال لوگ ہیں اور یہاں رہنے کے مستحق بھی نہیں ہیں اور اُن کو رکھنے کی وجہ سے ہم روس کی ناراضگی کا ہدف بن سکتے ہیں۔ گویا اگر مہاجرین کو نکال دیا

جائے اور افغانستان پر روسی تسلط کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر پاکستان کو کوئی خطرہ نہیں۔ حالانکہ افغانستان روسی فتح کا پہلا پڑاؤ ہے۔ جہاں سے ایک طرف پاکستان کی جانب اور دوسری طرف پٹرولی ممالک کی جانب سارا فاصلہ دو قدم کا ہے۔ یہ دو قدم آج نہ طے ہوئے تو دو چار سال بعد سہی!

مختصر یہ کہ ایک استعماری سپر پاور ہمارے سر پر آپہنچی ہے اور پے در پے ہمارے علاقوں پر بمباری کر کے وہ انتباہ دے رہی ہے کہ ہمارا ساتھ دو اور ہماری پالیسیوں کی حمایت کے لیے کمربستہ ہو جاؤ، ورنہ افغانستان کی طرح تمہارے خلاف بھی جارحیت ہو سکتی ہے جس کے دو دو ہاتھ ہم نے دکھا دیئے ہیں۔

یعنی ایک حویلی میں لوٹ مچانے والا حملہ آور کہہ رہا ہے کہ ہمارے خلاف آواز نہ اٹھاؤ، اس حویلی سے جان بچا کر نکلنے والوں کو پناہ نہ دو، ورنہ تمہاری حویلی کی بھی خیر نہیں اور اگر شور نہ کریں اور کسی کو پناہ نہ دیں تو بھی جس دستور و اخلاق کے تحت برابر والی حویلی لٹ رہی ہے وہی دستور و اخلاق ایک دن ہمیں بھی نشانہ بنائے گا۔

خیر تو ادھر کی سرحد پر کھلے حملے ہو چکے ہیں، اور ساتھ کے ساتھ ہمارے معاشرے کے اندر بھی پروپیگنڈے اور افواہوں اور نظریاتی محاذ پر بس ہمارے خلاف کام ہو رہا ہے نیز تربیت یافتہ تخریب کار بھی یہاں داخل ہو چکے ہیں جن کی سرگرمیوں سے دو نتیجے مطلوب ہیں: ایک یہ کہ خود مہاجرین کے خلاف نفرت پھیلے کہ چونکہ افغانستان سے آنے والے ہی ہنگامے اٹھا رہے ہیں، لہٰذا وہاں سے آمدہ تمام لوگ ناقابلِ اعتماد ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام لوگوں میں دہشت پھیلے اور ان کا اضطراب حکومت کو مجبور کر دے کہ وہ روس کے پاؤں پکڑ کر نجات کی کوئی صورت پیدا کرے۔

مزید برآں، ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ ہونے والے انتخابات میں حامیانِ روس کی پروپیگنڈا مشینری بھی اپنا کام زور و شور سے کرے اور ایسے افراد بھی اقتدار تک پہنچنے کے لیے کوئی خوشنما نقاب چہرے پر ڈال کر انتخابی کشمکش میں شریک ہو جائیں۔

اب لیجیے جنوبی اور جنوب مشرقی سرحد کو۔ اس سرحد پر جھڑپیں بڑھ گئی ہیں۔ لداخ کی جانب سرحد کے آخری حصے میں بھارتی فوج نے ایک زوردار حملہ کیا اور کشمیر کی کنٹرول لائن کو توڑ کر پاکستانی علاقے میں واقع گلیشیر کے بہت بڑے رقبے پر قبضہ جما لیا ہے۔ تازہ خبروں کے مطابق چین کی جانب کا مزید رقبہ بھارت کے پاس چلا گیا ہے۔ اس مقام سے شاہراہ ریشم بھارت کی زد میں آجاتی ہے۔ جب کہ اس کے سرپرست حلیف روس نے شاہراہ کی دوسری جانب واخان کی بلندی پر قابو پا لیا ہے۔ چین پاکستان رابطے کی شاہ رگ کے دونوں جانب نشترِ زہر آگیں رکھے ہیں۔

ادھر بھارت کی فوج معیاری تعداد میں پاکستانی سرحد کی ملحقہ چھاؤنیوں میں آچکی ہے اور خط سرحد کے قریب بھی ان کی نقل و حرکت ہوتی رہتی ہے۔ آج کی یہ خبر بھی قابلِ توجہ ہے کہ بھارت نے مگ ۲۳ نامی لڑاکا بمبار طیاروں کو پاکستان سے ملحقہ اڈوں پر منتقل کر دیا ہے اور ۴۰ طیاروں پر مشتمل دو اسکواڈرن جودھپور کے ایڈوانس بیس پر رکھے گئے ہیں۔ اس طرح پاکستان کے تمام اہم مقامات کو زد میں لینے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ روس سے جدید مہلک ترین اسلحہ کے انبار کے انبار قسط در قسط چلے آرہے ہیں۔ بھارت کی اپنی فیکٹریاں ہلکے اور معیاری اسلحہ کے انبار لگا رہی ہیں۔ ہماری ایٹمی تجربہ گاہ جو کہوٹہ میں ہے، اس پر اسرائیل کے اشتراک سے بھارت کی طرف سے ناگہانی حملہ کرنے کا اعلانِ عام سامنے آچکا ہے۔ سندھ میں بھارت مقامی ہندو آبادی اور سیکولرسٹ دانشوروں کے ذریعے پاکستان کے خلاف اپنا لٹریچر اور پروپیگنڈا پھیلا رہا ہے اور آدمی گھسا رہا ہے[1]۔ جس کے زیر اثر نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ایک تعلیمی مرکز میں پاکستان کا جھنڈا لگانے والوں کے

---

[1] مبینہ طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری سندھی یونیورسٹیوں میں بھارت سے جعل سازیاں کر کے ہندو نوجوان آتے ہیں اور ہمارے خرچ پر ڈاکٹری اور دوسرے علوم کی تحصیل کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ سانحے سامنے آتے رہتے ہیں۔ سندھ کی ہندو آبادی کے لیے کوئی نظم یا کنٹرول اور ضروری ریکارڈ کے ہونے نہ ہونے کا ہمیں علم نہیں۔

خلاف مخالفین نے خون ریز بلوہ کیا اور جھنڈا نہیں لگ سکا۔ کچھ حادثے ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا ہمارے لیے مناسب نہیں۔ اسکیم یہ ہے کہ سندھ کو بھارت خراب کرے اور بلوچستان میں روس نقب لگائے اور وقت آنے پر پنجاب کو ایک طرف رکھ کر سندھ اور بلوچستان کو الگ کاٹ لیا جائے۔ اس پروگرام کے لیے پیدل فوج، ٹینکوں اور آرمرڈ کاریوں توپ خانوں، فضائی اور بحری قوت میں تیزی سے اضافہ کیا جا رہا ہے۔

اِن فوجی سرگرمیوں کے پیچھے اندرا گاندھی[1] کا ذہن اس طرح کام کر رہا ہے کہ بھارت کے مختلف علاقوں میں جو مخالفانہ سیاسی طوفان اُٹھ رہا ہے اُس کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے ہندو سلطنت کی نگاہوں میں پاکستان کو ہوّا بنا دیا جائے اور موقع ملتے ہی کوئی جنگی اقدام کر ڈالا جائے۔ اس سلسلے میں شور برپا ہے کہ پاکستان نے بہت اسلحہ جمع کر لیا ہے اور یہ بھارت کے خلاف استعمال ہونے ہی والا ہے۔ پاکستان کی طرف سے یہ آخری چارۂ کار تھا کہ اُس نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیش کش کر دی۔ مگر بھارتی ڈپلومیسی نے اس پیش کش کو اپنے پروپیگنڈے کی گرد میں بالکل دفن کر دیا۔ اب بھارت کے اندرونی پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ مغرب میں عالمی سطح پر پاکستان کے مسلح ہونے کے خلاف اور جوہری توانائی پر کام کرنے کے خلاف پے درپے طوفان اُٹھائے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ڈپلومیٹک حلقوں میں اسرائیلی ماہرین کے تعاون سے پاکستان کے لیے ایڈ اور اسلحہ کی ترسیل کو رکوانے کے لیے کسی قدر ظاہراً اور زیادہ تر باطناً پُرزور کام کیا جا رہا ہے۔

اِس طوفانِ برق و ژالہ میں گھرے ہوئے ہمارے قافلۂ قوم کے احوال و مشاغل پر بھی چھچھلتی نظر ڈال لیجیے۔

جرائم کا یہ حال کہ مسلح افراد دن دہاڑے بڑے بڑے شہروں کے پُررونق علاقوں میں بنکوں اور جوہریوں کی دکانیں لوٹ کر آرام گاڑیوں پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ شاہراہوں پر ٹرکوں

---

[1] اشارات کی کتابت مکمل ہونے کے بعد پریس کو بھیجتے ہوئے یہ اطلاع ملی کہ اندرا گاندھی پر قاتلانہ حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ ہندو قوم اور اندرا گاندھی کے خاندان کو جو صدمہ پہنچا ہے اس پر ہم اظہار ہمدردی کرتے ہیں (ادارہ)

بسوں اور کاروں کو ڈاکوؤں کی ٹولیاں آئے دن لوٹتی رہتی ہیں۔ کہیں عورتوں کے کپڑے نوچ کر ان کو بازاروں میں ننگے پھرایا جاتا ہے اور کہیں خواتین کے ناموس کبھی گھروں میں گھس کر، کبھی تھانوں اور حوالاتوں میں اور کبھی کسی ڈاکٹر کے کلینک یا آپریشن تھیٹر میں لوٹ لیے جاتے ہیں۔ ایک تازہ اخباری رپورٹ کے مطابق جیل جانے والے نوجوان مجرموں کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ جرم کی شیطانی قوت نے انسدادِ جرم کے مراکز میں آشیانے بنا لیے ہیں۔ کتنے ہی پولیس کارکنوں کے خلاف پچھلے دنوں کارروائیاں کی جا چکی ہیں اور اُن سے کہیں زیادہ ایسے بھی ہوں گے جو گرفت میں نہیں آسکے۔ پولیس میں کوئی رپورٹ درج کرانے جائے یا تفتیش کے لیے کسی کو گرفتار کر کے لے جایا جائے، بالعموم سب نذرانہ پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔[1] باقی رہا ناشائستہ سلوک سو وہ "خدمتِ عام" ہے۔ خلیجی ممالک میں جانے کے حریص افراد سے چالاک لوگ روپیہ اینٹھ کر ان کو جعلی پاسپورٹ اور ویزے فراہم کرتے ہیں جس کے تلخ نتائج اندھے طالبانِ دولت کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ کالجوں اور درس گاہوں میں یونینوں پر پابندی کے بعد بھی غنڈہ گردی ہوتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خرابی کا اصل سبب یونینز نہیں تھیں۔ منشیات کی برآمد اور تعیشات کی ناجائز طریقوں سے درآمد بڑھ رہی ہے۔ جعلی مہروں کے ساتھ مصنوعات اور ان کے پرزے دستیاب ہیں اور وہ مارکیٹ میں اس طرح گڈمڈ ہیں کہ کسی عام خریدار کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اصل کونسی ہے اور نقل کونسی۔ نوجوانوں میں نشہ بازی (خصوصاً ہیروئن سے لذت اندوزی) کی وبا تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف سے شراب بندی کی کوشش ہے تو شیطان نے دوسری طرف ایک نیا راستہ کھول دیا ہے جس پر گرفت کرنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔

بسوں اور ویگنوں نے الگ اپنی مصیبتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ بوریوں کی طرح آدمیوں کا

---

[1] کراچی کے حالیہ ہنگاموں کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ مبینہ طور پر پولیس نے گلیوں میں گھس گھس کر بہت سے بے گناہ شہریوں کو پکڑ لیا ہے اور ان سے سودے کر کر کے اُن کو چھوڑا جاتا ہے۔

نذر مٹھنا اور بندروں کی طرح لٹکنا ایک طرف، ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کی بدسلوکیاں دوسری طرف، ٹیپوں سے واہیات گانے سنوانے کی شامت تیسری طرف، اور حادثات کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی بذریعہ قتل چوتھی طرف۔

یہ ہے حال اس قوم کا جس کے لیے جانے کہاں کہاں چھریاں تیز ہو رہی ہیں۔

پستی کا ایک پہلو یہ ہے کہ شہروں میں بازارگردی، آوارہ خرامی، تفریحی پارکوں میں بدتمیزی کی رو بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ شور و غوغا ہیجان، بدنظمی و بے ترتیبی عام، بسوں اور ویگنوں میں سفلہ پن کے تماشے معمول، اور غلاظت اور کوڑا سڑک سڑک اور گلی گلی کی زینت ہے۔ کہیں گٹر ابل رہے ہیں اور کہیں سرِعام گلیوں کو گھر کا بیت الخلا سمجھ کر تہذیب و شائستگی کو پیشاب سے نہلایا جا رہا ہے۔

نئے دور کے "ٹیلی وژن زدہ" بچے گلی گلی ہاکی اور کرکٹ کی گراؤنڈیں بناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شور شرابے اور گالم گلوچ اور ضرورت پڑے تو آپس میں مار دھاڑ کا ڈراما بھی کر لیتے ہیں۔ کبھی کرکٹ کی گیند کسی کا کلا پھوڑتی ہے، کبھی کسی کی عینک توڑتی ہے اور کبھی کسی گاڑی کا شیشہ کرچی ہو جاتا ہے۔ پتنگ بازی کا زمانہ ہو تو پھر بانسوں پر بندھے جھاڑ جھنکاڑ ہاتھوں میں لیے اور نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائے یہ بچے سڑکوں پر ٹریفک کے لیے آفت بنتے ہیں اور گلیوں میں راہگیروں سے ٹکراتے ہیں۔ چھتوں پر ہوں تو پردے کا لحاظ اور نہ کسی کی گھریلو پرائیویسی محفوظ!

یہی بچے دس بارہ سال کی عمر میں کہیں کاریں اور کہیں سکوٹر اس حال میں بھگاتے نظر آتے ہیں کہ کبھی کبھی سکوٹروں پر چار چار سواریاں لدی ہوتی ہیں، جن میں ایک آدھ ایستادہ بھی ہوتی ہے۔ کہیں درختوں پر لٹک لٹک کر ان کی ٹہنیاں توڑتے ہیں، کہیں پبلک مقامات سے یا دوسروں کے بیرونی پائیں باغوں سے پھول توڑتے ہیں۔ کہیں سڑکوں اور دیواروں پر چاک یا کوئلے سے لٹریچر یا مصوری کے شاہکار ثبت کرتے ہیں۔ کوئی گاڑی کھڑی دیکھی تو اسے چھیڑنے لگے، کسی کا سائیکل ہاتھ چڑھا تو اس کو انجینیری کا نشانہ بنا لیا۔ دن کا پچھلا پہر بیرونِ خانہ کے کھیل کود میں بسر کیا۔ اور شام کے بعد دو تین گھنٹے کے لیے ٹیلی وژن کے سامنے

زانوئے ادب تہ کر لیا۔ ان کے حرکات و مشاغل کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے ماں باپ بھی ہیں۔ اور کبھی کسی نے ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی ہے اور انہیں کوئی نصیحت یا تادیب کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ”ٹیلی وژن زدہ“ بچوں کے سامنے ماں باپ کی چلتی ہی نہیں۔ وہ بیچارے دم سادھے نئی نسل کی ترقیات کو دیکھتے رہتے ہیں، بلکہ اکثر ان کی بے راہ روی پر خوش بھی ہوتے ہیں۔ میں نے تو ایسے مناظر بھی دیکھے ہیں کہ تین تین برس کے بچوں کو نرسری اسکولوں میں پھینک کر ماں اور باپ اس طرح بھاگتے ہیں کہ جیسے ان کے سر سے بلا ٹلی۔ ایسے لوگوں کی اولادیں عقلی و معاشی حیوانات کے علاوہ کیا بنیں گی؟

معاشرے کا عام حال یہ ہے کہ اب نہ بزرگوں کا ادب ہے، نہ چھوٹوں کے لیے شفقت۔ استاد اور شاگرد کا تعلق خراب ہو چکا ہے۔ اکثر لوگ دیوار بیچ کے پڑوسی سے کوئی تعارف نہیں رکھتے۔ ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کم ہوتی جا رہی ہے اور ایک دوسرے کے کاموں میں مدد کا جذبہ مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ کجا یہ کہ کوئی کسی کے لیے ایثار دکھائے۔

پھر زندگی میں مرکزی حیثیت دولت کو حاصل ہو گئی ہے جس کے سامنے نہ علم کی وقعت ہے، نہ ادب کا مرتبہ، اور نہ خلق و شرافت کی کوئی قیمت، نہ سیاسی کارکنوں کی بے لوث خدمات کے لیے کوئی اعتراف۔ انسانیت کی زرق برق حسین قدروں کا جمال ماند پڑ گیا ہے۔ ہر کوئی دولت کی اُڑتی ہوئی سنہری اور روپہلی پریوں پر نظریں جمائے بھاگ رہا ہے۔ معیارِ زندگی کی مختلف بلند اور بلند تر چوٹیوں پر چڑھائی کا آلہ ہے۔ دولت ہے تو سماجی مرتبہ بھی ہے اور سیاسی وقعت بھی۔ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دولت کی ہوس اسراف و تبذیر کو ساتھ لاتی ہے۔ دولت کے ساتھ نمائشِ دولت کا شوق بڑھتا ہے۔ فیشن اور میک اَپ کی وبائیں پھیلتی ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی تقریبوں کے ذریعے اپنے قد کو اونچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور قرض لے کر بھی ’گھر پھونک تماشہ دیکھ‘‘ کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ حصولِ دولت کے اندھے جنون نے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے فرق کا احساس ختم کر دیا ہے۔ مال چاہیے، خواہ رشوت سے ملے یا سود سے، لُوٹ مار سے یا مکر و فریب سے۔ بس یہی معراجِ انسانیت ہے۔ کوئی اُصول نہیں، مقصد نہیں، نصب العین

نہیں، دینی دعوت یا مشن کی کوئی مصروفیت نہیں، قومی خدمت کا کوئی پروگرام نہیں، سیاسی لحاظ سے مفید سرگرمیوں کے لیے تگ و تاز نہیں، علم و تحقیق کی دلچسپی نہیں، سائنسی میدان میں ایجاد و اختراع نہیں، دفاعی ضرورتوں کے لیے جسمانی مشقوں اور تنظیمی سرگرمیوں اور معلوماتی پروگراموں کا کوئی اہتمام نہیں، تعلیمِ بالغاں کے کام کا شوق نہیں، حتیٰ کہ گلیوں کی صفائی اور محلہ کی بہبود کے لیے کسی جگہ لوگوں میں کوئی حرکت نہیں۔

یہ ہے اس قوم کا حال جس کو وقت کے ایک بھاری چیلنج نے دو طرفوں سے گھیر رکھا ہے اور مصیبت و بلا کے لشکر تلے کھڑے ہیں۔

سیاسی حالات پر نظر ڈالیں تو ہماری کتاب آزادی سے جمہوریت کا جو نا تمام باب ۱۹۵۸ء سے نکال لیا گیا، نہ اس کے اوراق بحال کیے جا سکے اور نہ اُسے از سرِ نو لکھا جا سکا۔ ایک دھندلی سی اُمید لگی ہے کہ شاید ۱۹۸۵ء سے جب کہ ۵۸ء کا ہندسہ اُلٹ جائے گا، انتخابات کا دروازہ کھل جائے۔ ۲۷ سال کے اس لمبے عرصے میں جماعتوں کو اس بُری طرح کچلا گیا اور سیاسی اکابر کی اتنی کردار کشی ہوئی کہ اب یوں لگتا ہے کہ اب سارے حدیقۂ سیاست میں کہیں کوئی ایک بھی سرو و صنوبر موجود نہیں ہے۔ ہر طرف فقط سبزۂ بیگانہ لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ کوئی ملک جب اس طرح سیاسی لیڈروں کی ٹیم سے محروم ہو جاتے اور جماعتوں کے کارکن پس بچک جائیں تو عوام کی تنظیم اور تربیت کا کام تباہ ہو جاتا ہے۔ محض حکم و قانون اور بیوروکریسی اور پولیس کے ذریعے اس کمی کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ سیاسی طور پر جس قوم کے افراد تنظیموں کے بندھن سے آزاد ہو کر بکھر جائیں وہ کسی بڑے چیلنج کا مقابلہ آسانی سے نہیں کر سکتی۔

ملک گیر جماعتیں مختلف برادریوں اور صوبوں کے اندر نفوذ کر کے وحدت پیدا کرتی ہیں اور جن علاقوں یا طبقوں میں شکایات پائی جاتی ہیں، ان کے بارے میں اپنے کارکنوں کی رپورٹوں سے آگاہ ہوتی ہیں جن کو عوام کے مختلف عناصر سے قریب رہنے والے افراد تیار کرتے ہیں۔ وہ

جائز امور میں ان کی ترجمانی اور ان کے ازالۂ شکایات اور ان کی حقوق رسانی کے لیے آواز اٹھا کر ملک و قوم کے مفاد کے خلاف جانے سے روک کر ان کو اپنے ساتھ ملاتی ہیں۔

ہماری ایک سیاسی مصیبت یہ ہے کہ دستور کے معاملے میں شطرنج کے مہروں کی طرح بار بار ایک خانے سے دوسرے میں منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ پہلے ایک بار دستور ۵۶ء پر قوم مطمئن ہوئی۔ سو اسے دورِ ایوبی نے ختم کر کے بنیادی جمہوریت کے تصور پر مبنی دستور ۶۲ء نافذ کیا۔ پھر اگلے دور میں وہ ختم ہوا اور دستور ۷۳ء پر قوم متفق ہو گئی۔ نیا مارشل لا آیا تو پھر اگرچہ وہ دستور ابھی پوری طرح ختم نہیں کیا گیا۔ مگر اس کے مرکزی تصورِ حکمرانی کو یکسر بدل کر اسلام کی ایک تعبیرِ جدید کے تحت "شورائی کریسی" کا ایسا نظریہ پیش کر دیا گیا جس کا مدعا مغربی جمہوریت کی خرابیوں سے ملک کو بچانا بتایا جاتا ہے مگر دوسری طرف یہ تصور آمریت کا راستہ کھولتا ہے۔ جس پر صدر ضیاء اگر نہ بھی چلیں تو بعد میں کوئی سلطان ظلِّ الٰہی کے پر لگا کر آ پہنچے گا اور اس کے لیے کوئی روک ٹوک نہ ہو گی۔

سیاسی جماعتوں کو کالعدم کر کے یہ سمجھنا کہ اب یک جماعتی نظام کے حالات پیدا ہو گئے ہیں، شدید غلط فہمی ہے۔ لوگ یک جماعتی نظام یا لاجماعتی نظام کا فرق نہیں سمجھتے۔ اس نافہمی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کو نمونہ بنا کر کہتے ہیں کہ وہاں تو ایک ہی جماعت تھی۔ قطع نظر اس سے کہ اس جماعت کے ساتھ یہود و مشرکین کی جماعتیں بھی مدنی دور میں شریکِ نظمِ ریاست ہو گئیں اور خود اس جماعت کے اندر اصولوں پر متفق رہنے کے باوجود مہاجرین و انصار کے فرق کے علاوہ مفاد و مصالح کے لحاظ سے مختلف گروپ موجود تھے۔ وہاں جو جماعت تھی اس کے لیے ایک ایک فرد کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست دعوت دے کر جمع کیا تھا۔ اور پھر ان کو دینی تعلیم و تربیت بھی دی، نظم میں بھی پرویا اور ان کو اقامتِ دین کے نصب العین پر شعوری طور پر متحد کیا۔ آج ملّت کے مختلف الخیال اور مختلف العمل افراد کو رسول اللہ کی طرح دعوت دیے بغیر اور تربیت سے گزارے بغیر اور نظم میں پروئے بغیر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہاں ویسی ہی ایک متحد و منظم اور تربیت یافتہ

جماعت موجود ہے، جس کے بل پر یک جماعتی نظام چلایا جا سکتا ہے۔ یک جماعتی نظام متفرق افراد کے بل پر نہیں چلتا اور نہ متفرق افراد کو جماعت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں کی مسلم قوم تو واحد قوم ہے، مگر اس واحد قوم کی واحد جماعت موجود نہیں۔ گویا یک جماعتی نظام کے علمبردار دراصل ہمیں متفرق افراد کے بل پر قائم ہونے والے لاجماعتی نظام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یک جماعتی نظام میں اگر آمریت کے ابھرنے کے مواقع ساٹھ ستر فیصد ہیں تو لاجماعتی نظام میں سو فیصد[1]!

سیاست کے چرخ گرداں کا ستم یہ ہے کہ سیاسی حقائق اور اسلام کے سیاسی اصولوں اور فارمولوں کے متعلق برسوں کی کاوشوں سے دینی حلقوں کا جو ذہن بن چکا تھا، اُسے پل بھر میں اُدھیڑ دیا گیا ہے۔ اب ہر چیز متنازعہ فیہ اور مشتبہ بن گئی ہے ـــ مختلف افراد ـــ کہیں بڑے اور کہیں چھوٹے ـــ تحریر و تقریر میں ایسی ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جو پچھلے تیس ۳۰ سال سے نہیں کہی گئیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے پوری قوم میں عموماً اور دینی حلقوں میں خصوصاً اتنا انتشار و افتراق واقع ہو چکا ہے کہ اب لوگوں کا مل کر چلنا تو کجا، مل بیٹھنا بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ وحدتِ فکر کا رشتہ ہی ٹوٹ چکا ہے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے سیاسی خلا کے جاری رہنے اور سیاست کو قابلِ نفرت قرار دینے کا۔

خرابی سیاست میں خود سیاسی لیڈروں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ حضرات اُصولوں

---

[1] نام کے یک جماعتی نظام کے پردے میں جو لاجماعتی نظام پسند کیا جا رہا ہے، اس میں فرد فرد اس طرح الگ الگ ہو گا جیسے کسی مشین کے پُرزے کھول کر رکھ دیے جائیں۔ جماعتیں اپنے نظریات اور پروگراموں پر متفق ہونے والے شہریوں کو جمع کرتی ہیں اور کئی کئی لاکھ افراد کے چند یونٹ بن جاتے ہیں، جن کی کوئی سوچی سمجھی رائے ہوتی ہے اور جسے ان کے لیڈر بیانوں اور قراردادوں کے ذریعے سامنے لاتے ہیں۔ اِس طرح آبادی میں پائے جانے والے نقطہ ہائے نگاہ اور اُن میں سے ہر ایک کے حامیوں کی قوت کا اندازہ رہتا ہے۔ یہ نہ ہو تو ہر چیز مبہم ہو جاتی ہے۔

کی سیاست سے بڑھ کر "مواقع" کی سیاست پر کاربند رہے ہیں۔ اگر کسی اُصول و مقصد کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے مطابق اپنا اور اپنی جماعت کا کردار نہیں بنا سکے۔ اُنھوں نے پیروکار تو جمع کیے مگر ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا سامان نہ کر سکے، بلکہ جو درج رجسٹر ہو گیا، سو ہو گیا۔ کوئی اِدھر سے ٹوٹ کر اُدھر چلا گیا، کوئی اُدھر سے ٹوٹ کر اِدھر آ گیا، اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے۔ نہ اِدھر کوئی خاص سانچہ ہے، نہ اُدھر کوئی ممیزڈ یزائن۔

پھر یہ لیڈر حضرات بار بار ایسے تجربے کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ پہلے قومی اتحاد بنا جس کے خاص مقاصد تھے اور خاص مزاج۔ اس کا بندھن بغیر کسی دلیل کے توڑ دیا گیا۔ اور پھر اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر سب الگ الگ مورچوں میں بیٹھ گئے۔ پھر مارشل لا نے دبایا تو انھوں نے قومی اتحاد سے بالکل متغائر قسم کا ایک اتحاد ایم آر ڈی کے نام سے قائم کر لیا۔ اب اس اتحاد کے بندھن بھی ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اب ان اکابر کے سامنے کوئی دوسرا نقشہ تاحال نہیں ہے۔ ان حضرات نے اپنے قد کو خود چھوٹا کیا ہے اور عوام کی نگاہیں جو کبھی ان پر مرتکز تھیں، بکھر گئی ہیں۔ سوچیے کہ جہاں قائدین کا یہ کردار ہو وہاں وہ کیا کارنامے دکھا سکتے ہیں۔ کوئی شخص تو ایسا ہوتا جو کسی ایک ہی موقف پر ہر قسم کے مزاحمانہ حالات میں جما کھڑا رہتا۔ اب ایسے لیڈر جو نہ ثبات دکھا سکیں، نہ معقول طرز کا کوئی اتحاد قائم کر کے اُسے نبھا سکیں، ان کی خدمات سے قوم کو آزمائش کے لمحات میں کیا امداد ملے گی۔

نوبت بایں جا رسید کہ سابق معرکہ ہائے سیاست کے نامور لیڈر جو آج جگہ جگہ "مجروح" پڑے ہیں۔ وہ بھی آپس میں خیرسگالی تک کا جذبہ نہیں رکھتے۔ اور نہ سیاست کُش اور جمہوریت شکن صورتِ حالات کے بارے میں کوئی متفقہ تعمیری نقطۂ نظر بنا سکے ہیں۔ اس "بے ہمگی" نے ان کی وقعت کو اور بھی گھٹا دیا ہے۔

کیا یہ فضا دفاعی نقطۂ نظر سے اچھی فضا ہے؟

اب ایک اور پہلو پر غور کیجیے۔

نوے دن کے اندر انتخابات کرانے کا اعلان کرنے والی حکومت نے جس عملِ تطہیر کے لیے سات سال گذار دیے ہیں اس کا سوائے سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کے اسٹیج سے گم ہوجانے کے، اور کوئی نتیجۂ خیر پیدا نہیں ہوسکا۔ یہ انتخابات اگر ایک بار ملتوی ہوئے بھی تھے تو انہیں ایسے موقع پر جلد سے جلد منعقد کر لینا چاہیے تھا جب کہ موجودہ حکمران قوت کی مقبولیت و محبوبیت عروجِ کمال پہ ہوتی، تاہم اس پر بھی اللہ کا شکر کہ اب یہ امید دلائی گئی ہے کہ ۸۵ء کے آغاز میں یہ مرحلہ طے ہوجائے گا۔ مگر سارے متعلقہ حقائق ابہام میں ہیں۔ نظام صدارتی ہوگا یا وزارتی؟ جھکاؤ عوامیت کی طرف ہوگا یا آمریت کی طرف؟ "شوریٰ کریسی" کیا ہے؟ کیا شوریٰ پوری طرح نمائندہ ہوگی؟ کیا اس کے فیصلے مؤثر ہوں گے؟ اس کے انتخابات کا طریقہ کیا ہوگا؟ سیاسی جماعتیں کام کر سکیں گی یا نہیں؟ دستور ۷۳ء برقرار رہے گا یا کوئی نیا تجربہ شروع ہوگا؟ اس سارے نظام میں جمہوریت کی روح کس حد تک ہوگی؟ مارشل لا بھی ساتھ ساتھ چلے گا یا ختم ہوجائے گا؟ یہ سارے سوالات اپنے جوابوں کی تلاش میں فضا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ شہری گومگو کی حالت میں ہیں۔ لوگوں کے لیے آگے کچھ سوچنا ہی ممکن نہیں ہے۔ یہ ذہنی تعطل اتنا طویل ہوگیا ہے کہ اب وہ خطرہ ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے اپنی ہی قوم پر پورا اعتماد نہ ہو اور ان سے الگ تھلگ بیٹھ کر خفیہ طور پر نقشے بنائے جا رہے ہوں۔ اس طرح کی بے اعتمادی صحت مندانہ سیاسی نشوونما نہیں ہونے دیتی۔

بہتر یہ ہوتا کہ ایک سہ ماہی پیشتر سیاسی لیڈروں کی میٹنگ بلا کر پورا منصوبہ ان کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ اور ان کو رائے دہی اور تنقید کا موقع دیا جاتا۔ پھر افہام و تفہیم سے کوئی ایسی متفقہ صورت اختیار کی جاتی کہ جس کی برکت سے اربابِ حکومت اور اصحابِ سیاست کا فاصلہ کم ہوجاتا۔ اس طرح حکومت، سیاسی لیڈر اور عوام ایک لائن میں آجاتے۔ اگر یہ کام پہلے نہیں ہوا تو اب ہوجانا چاہیے۔

آزمائشی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین صورت یہی ہے۔

دفاع وہی قوم کرسکتی ہے جس میں سیاست زندہ ہو، جس کے سیاسی لیڈر نمایاں ہوں اور جس کی سیاسی جماعتیں قوت رکھتی ہوں اور جس میں ذی اختیار نمائندہ ایوان موجود ہوں۔ خطرات کے موقعوں پر جب اقتدار کے پیچھے سیاسی لیڈر اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ صف بستہ ہوکر رائے عام کو مضبوط و متحرک کرتے ہیں اور لوگوں میں ذمہ داری کا شعور و احساس پیدا کرتے ہیں تو اس طرح وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو ٹینکوں، توپوں، میزائیلوں اور ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے۔

اچھی دفاعی قوت کے لیے بہت اچھے نظامِ تعلیم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک اچھا نظامِ تعلیم معلومات کے علاوہ صحیح اعتقادی، نظریاتی اور مقصدی شعور بھی دیتا ہے۔ نوجوانوں کو صداقت، دیانت، شجاعت، عدالت اور سخاوت پر مبنی اعلیٰ کردار سے آراستہ کرتا ہے، اور نظریاتی و مقصدی شعور اور اعلیٰ کردار ہی اُن میں سچا جذبۂ دفاع پیدا کرتا ہے۔ اُن میں یہ سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے کہ معاملہ صرف زمین کی مٹی اور اس کی خاک کی حفاظت ہی کا نہیں ہے بلکہ ہمیں اپنے عقیدوں، نظریوں، اپنے اعلیٰ مقاصد، اپنی اخلاقی اقدار، اپنے تہذیبی اطوار، اپنی تاریخی روایات، اپنے مخصوص اجتماعی اداروں اور طہارت قلب و نظر پر مبنی ثقافتی فنون و مظاہر کی حفاظت بھی کرنی ہے، کسی فاتح کی غلامی میں صدیوں کا یہ قیمتی ورثہ برباد ہو کے رہ جائے گا۔ اور ہمارا ملّی تشخص کرچی کرچی ہو جائے گا۔

ہمارے نظامِ تعلیم نے نصابی کتب میں اس طرح کے مواد کے کچھ متفرق اجزا تو (بغیر کسی ولولہ انگیزی کے) داخل کیے ہیں، مگر ابھی اس نظام میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ متذکرہ بالا انداز پر ذہن و کردار کو تیار کرسکے۔

پھر ستم یہ کہ اس نظامِ تعلیم کے رگ و پے میں ملحدانہ تہذیب کے ایسے زہریلے نظریات سرایت کیے ہوئے ہیں، جو اسلامی طرزِ فکر کے لیے تباہ کُن ہیں۔ مثلاً نظریہ ارتقا کو تو ایسے یقین و اذعان اور بغیر کسی تنقید و اختلاف کے ابتدائی درجوں سے لے کر اعلیٰ سطحوں تک

نصابی کتابوں میں داخل کر دیا گیا ہے جیسے وہ خالص الہامی تعلیم ہو اور خدا کے پیغمبر اسے لے کر آئے ہوں۔ پھر سیاست، جمہوریت، سوشلزم، الہیات، منطق، اخلاقیات، عمرانیات، جدید نفسیات، تجزیہ نفس، نظریہ علم کے مروجہ تصورات اساتذہ فرنگ سے اخذ کر کے اپنی کتابوں میں اس طرح بلا تنقید جذب کر لیے گئے ہیں کہ برسوں سے ہمارے طبقات میں مخالف اسلام فکر باطلہ کی کسی شاخ کے خلاف کبھی کوئی رد عمل پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ ہماری ضرورت یہ ہے کہ غیر اسلامی افکار و نظریات کے باغی ہمارے ہاں ابھریں۔ اور وہ علوم کی تشکیل جدید اسلامی ذہن سے کریں۔

پھر مخلوط تعلیم کی بلا ہم پر مسلط ہے، حالانکہ مغرب کے جدید ترین مفکرین و مفکرات اس کے نتائج بد کا رونا رو رہے ہیں[1]۔

نظام تعلیم کی ایک طرح یہ بھی ہے کہ افسر کلاس اور امیر کلاس کے بچوں کے لیے الگ نظام تعلیم ہے جہاں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے اور عوام کے لیے الگ۔ یک بام دو ہوا کا منظر۔ پھر مشنری اسکولوں کی آفت مسلط ہے۔ اردو نظام تعلیم کے ایوان میں پچھلے بنچوں پر کھڑی ہے۔

گویا تعلیمی لحاظ سے ہم ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے ذرا بھی قابل نہیں ہوئے اور اس حال زار میں ہمیں زمانے کے کسی خطرناک چیلنج کا کسی بھی وقت جواب دینا پڑ سکتا ہے۔ مشیت کے تحت تاریخ کے دریا کا مد و جزر کسی کا لحاظ اور انتظار نہیں کرتا۔

اگر قوت کے سب سے بڑے سرچشمے اور مزاحمت اغیار کے لیے سب سے اہم مورچے تعلیم گاہیں ہیں (اور یقیناً ہیں)، تو ہمارے ماہرین تعلیم، وزراء اور سیکرٹریوں اور اساتذہ کو تجدید تعلیم کے لیے جلد از جلد بھرپور کاوش کرنی چاہیے۔ (باقی بر صفحہ ۲۸)

۱؎ ارباب مال و جاہ کی بیگمات کا ایک چھوٹا سا گروپ اپنے معاشرتی مرتبے کے زور سے مخلوط تعلیم بلکہ مخلوط ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کو پھیلانے میں سرگرم عمل ہے، مگر ملک کی خواتین کی ایک بھاری اکثریت اس روش کے خلاف ہے۔ مختصر اقلیت کے ذوق اور فکر و روش کو بھاری اکثریت پر مسلط کیے رکھنا اجتماعی قوت کو کم کرنا ہے۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

ہماری دعوت اور بدلتے حالات

سوال:- پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے تحریکِ اسلامی کی سیاسی حکمتِ عملی کیا ہونی چاہیے؟

جواب:- پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے "ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیے" میں اس کا ایک اصولی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ ہمارے رفقا کسی غلط طرزِ فکر میں مبتلا نہ ہو جائیں - اس میں شک نہیں کہ ہم جس ملک میں، جس قوم میں، جس زمانے میں، اور جن حالات میں کام کر رہے ہیں، ہمیں کوئی پروگرام بناتے ہوئے اُن سب کو ملحوظ رکھنا پڑے گا - لیکن ہماری اُصولی دعوت لازماً ایک ہی رہے گی، ہمارا بنیادی مقصد بھی قطعاً ناقابلِ تغیر ہوگا، اور اپنا عملی پروگرام بناتے ہوئے ہم ان چیزوں کو صرف اس حیثیت سے ملحوظ رکھیں گے کہ اس ملک میں اس زمانے کے حالات میں اپنی دعوت کو کس طریقے سے فروغ دیں، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس قوم کے اچھے رجحانات سے کس طرح فائدہ اُٹھائیں، اور اس کے بُرے رجحانات کو کس طرح بدلیں کہ وہ ہمارے مقصد کی راہ میں کم از کم رُکاوٹ تو نہ بن سکیں - اس نقطۂ نظر سے ان چیزوں کو ملحوظ رکھنا تو عین تقاضائے حکمت ہے لیکن اگر ہم زمان و مکان کے حالات اور لوگوں کے رجحانات کو دیکھ کر اپنی دعوت اور اپنے مقصد ہی پر نظرِ ثانی کرنے بیٹھ جائیں تو یہ سراسر گمراہی ہے جس کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ آنا چاہیے - طریقِ کار حالات کے لحاظ سے بدلا جا سکتا

ہے۔ حکمتِ عملی میں لوگوں کے اچھے یا بُرے رجحانات کے لحاظ سے تغیر کیا جا سکتا ہے مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور اس کی دعوت کے جو اُصول مقرر کر دیے ہیں، ان میں ذرّہ برابر کوئی ردّ و بدل لوگوں کے رجحانات یا زمانے کے حالات کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جس چیز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہمیں ہر حال میں اُسی کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہوں، اُس کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اس مقصد کے لیے سعی و جہد کے ایک طریقے کو موزوں پا کر اختیار کر لیں اور دوسرے طریقے کو ناموزوں سمجھ کر ترک کر دیں۔ اِسی طرح جن چیزوں کو اللہ اور اُس کے رسولؐ مٹانا چاہتے ہیں اُن کو مٹانا ہی ہماری کوششوں کا ہمیشہ مقصود رہے گا، یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی استطاعت اور ملک کے حالات اور عوام کی مزاجی کیفیات کو دیکھ کر یہ طے کریں کہ کن چیزوں کو مٹانے کی کوشش مقدم اور کن کے مٹانے کی کوشش مؤخر رکھی جانی چاہیے۔ نیز یہ کہ اس غرض کے لیے ہم کونسی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں اور کن تدابیر کا اختیار کرنا غیر ممکن، غیر مفید، یا غیر مناسب ہے۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۴۰)

محمد یوسف صاحب ناظم لائبریری۔
ادارہ معارف اسلامی۔ منصورہ۔ لاہور

فلپائن، بنکاک اور بنگلہ دیش کا سفر

جناب خلیل حامدی صاحب

فرقہ پرستی سے پاک معاشرہ

۴ بجے کے قریب مورو تحریک کی ایک سرگرم شخصیت خلیفہ ناندو آئے۔ اُن کے ساتھ چار پانچ حضرات اور بھی تھے۔ دورانِ گفتگو انہوں نے بتایا کہ یہاں جو کانفرنس ۲۳ اپریل ۱۹۸۴ء کو منعقد ہو رہی ہے اس کے بلانے میں جنوبی فلپائن کی تمام اسلامی تنظیموں کی کوششوں کو دخل ہے۔ ان تنظیموں کی تعداد ۲۰ کے قریب ہے۔ ان سب نے مل کر یہ پروگرام بنایا ہے اور اس کے لیے بڑی تگ و دو کر کے حکومت سے اجازت نامہ حاصل کیا ہے۔ یہ اجازت نامہ وزارتِ ادیان کے شعبہ اُمورِ اسلامی کے ذریعہ ملا ہے۔ اس شعبے کے لوگ بھی اس کمیٹی میں شامل ہیں، جو کانفرنس کے انتظامات کر رہی ہے۔ تنظیموں کی بات چھڑی تو خاکسار نے خلیفہ ناندو صاحب سے دریافت کیا کہ یہ تنظیمیں اتنی کثرت سے کیوں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ لوگ شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے مقامی لوگ مل کر ایک انجمن بنا لیتے ہیں۔ یہ کام مفید ہے، مضر نہیں ہے۔ مذہبی رجحان پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی اور بتایا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ جنوب میں صرف ایک مذہب کی عملداری ہے۔ وہ ہے شافعی مذہب۔ اس بنا پر ہمارے اندر کوئی گروہی تفرقہ بازی نہیں ہے۔ ہاں، البتہ اب مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر کچھ نوجوان آئے ہیں۔ وہ سلفیت کے نام پر کام کر رہے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے طریقِ کار کی وجہ سے بدمزگی

پیدا ہو جاتی ہے۔ تصوف اور قبر پرستی کا ذوق بھی یہاں نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر قبر پرستی اور مشرکانہ رسومات اس ملک میں کہیں کہیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن جب سے دینی تعلیم کا آغاز ہوا ہے یہ چیز بھی از خود ختم ہو گئی ہے۔ شیعہ مذہب کے ماننے والے بھی فلپائن میں نہیں ملیں گے۔ ایران کے تین ہزار کے لگ بھگ طلبا یہاں کے مختلف تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہیں۔ وہ ان دنوں بڑے متحرک ہیں۔ بے پناہ لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ منیلا اور زمبوانگاہ ZAM- -BOANGA میں ان کے پروپیگنڈے سے کچھ با اہل شافعی شیعہ ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ جب ایران کا لٹریچر تقسیم کرتے ہیں تو یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ اصل اسلام وہ ہے جس نے ایران میں انقلاب برپا کیا ہے۔ کم خواندہ لوگ متاثر ہو جاتے ہیں۔ خلیفہ صاحب کے بیان کے مطابق اگر شیعہ طلبا کا پروپیگنڈہ یونہی جاری رہا تو یہاں مسلمانوں کے اندر ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو گا۔

کمیونسٹوں کی سرگرمیاں خلیفہ صاحب بڑے بالغ النظر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال حج پہ گئے تھے۔ واپسی پہ کویت اور پاکستان بھی دیکھ آئے ہیں۔ عربی زبان پہ اچھی قدرت رکھتے ہیں۔ خلیفہ نے بتایا کہ اس وقت کمیونسٹ پارٹی ملک کے اندر بڑی سرگرم ہے۔ اکینو کے قتل کو یہ پارٹی بہت استعمال کر رہی ہے۔ اس وقت مارکوس گورنمنٹ کی توجہ جنوبی مسلمانوں کی طرف کم اور کمیونسٹوں کی طرف زیادہ ہے۔

خلیفہ صاحب بڑے صاحب جذبہ اور فعال نظر آئے۔ فوراً کہنے لگے کہ یہاں کے نوجوانوں میں انگریزی زبان کا رواج عام ہے، کیونکہ پورا نظام تعلیم انگریزی میں ہے، اس لیے مسلمان نوجوانوں کے اندر اگر اسلام کی مخصوص اشاعت مطلوب ہے تو وہ انگریزی لٹریچر کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ عرب حضرات عربی زبان میں کتابیں بھیج دیتے ہیں، وہ صرف چند علماء ہی کے لیے مفید رہتی ہیں۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ انگریزی زبان میں ہمارے پاس لٹریچر ہو۔ کہنے لگے: مولانا مودودیؒ کا لٹریچر ہمارے لیے بہت مفید ہے۔ اگر وہ ہمیں وافر مقدار میں ملتا رہے تو ہم پیدائشی مسلمان کو ہی درست نہ کریں، بلکہ عیسائیوں کو بھی مسلمان بنا دیں۔ یہاں عیسائی تھوڑی بہت تبلیغ کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے۔ ایک وکیل نے از خود قرآن کریم کا

انگریزی ترجمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ بڑا خوشحال آدمی ہے۔ اس نے اپنی ایکڑ زمین بھی مسجد اور مدرسہ کی تعمیر کے لیے وقف کر دی ہے۔

فلپائن کا لسانی مسئلہ زبان کا ذکر چھیڑا تو خلیفہ نانددو نے بتایا کہ فلپائن کے اندر ۳ مسلم، ۶ غیر مسلم اور ۳ مسلم قبائل ہیں۔ ہر قبیلے کی زبان دوسرے قبیلے کی زبان سے اختلاف رکھتی ہے۔ تگالو زبان پورے ملک میں بولی جاتی ہے۔ یہ مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، بلکہ اسے شمال کے عیسائیوں کی زبان کہنا مناسب ہوگا۔ تیس سال سے حکومت نے اسے رواج دیا ہے۔ اسے فلپائنی عوام کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ یہ دارجہ زبان ہے، مگر اس میں لٹریچر پایا جاتا ہے۔ اخبارات و رسائل بھی اس زبان میں نکلتے ہیں۔ انگریزی زبان دفتر اور تعلیم کی زبان ہے۔ تگالو کے بعد اسے بڑا رواج حاصل ہے۔

اسلامی مدرسوں کے وفاق کا صدر آخر میں خلیفہ نانددو صاحب کا مزید تعارف کرلیجیے۔ موصوف ۱۹۷۰ء سے ازہر یونیورسٹی (اصول الدین کالج) کے گریجویٹ ہیں۔ اس وقت فلپائن کے اندر تمام اسلامی مدرسوں کے اندر ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک سپریم کونسل بنائی گئی ہے۔ موصوف اس کے صدر ہیں۔ تحریک اسلامی پاکستان سے خوب واقف ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہاں کے مدارس میں بھی تحریک اسلامی پاکستان جیسی فکر پھیلائی جائے۔ خود اعتمادی اور گہرے شعور پر مبنی ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں اگر کوئی فکری تحریک چلائیں تو کامیاب ہو سکتے ہیں۔

شوق و ذوق مغرب کے بعد عبدالبیان بھی آگئے۔ ان کے ساتھ دو اور رفیق تھے۔ ایک طہا اور دوسرے جمیل احمد صاحب۔ مؤخر الذکر ٹوٹی پھوٹی عربی بول لیتے ہیں۔ پاکستان میں بھی کچھ عرصہ رہے ہیں۔ عبدالبیان اپنے ساتھ ہمارے لیے گھر سے کھانا لے کر بھی آگیا: چاول، گوشت، انڈے اور کیلے۔ ایک طرف مجھے اس کی حالت پر رحم آرہا تھا اور دوسری طرف اس کی اس محبت بھری پیشکش کو خوش دلی سے قبول کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے اسے ان تکلفات سے منع کیا، مگر وہ کہنے لگا کہ میں نے جب گھر میں آپ کا ذکر کیا ہے تو میرے اہل خانہ کو شوق ہوا کہ وہ بھی آپ کی کوئی خدمت کریں خواہ برگِ سبز ہی سہی۔

کوتا باتو کی راتیں کھانا کافی تھا ہم چاروں نے خوب پیٹ بھر کھا لیا۔ عبدالبیان کے مشورے کے مطابق ہم چہل قدمی کے لیے باہر نکل گئے۔ بازاروں میں خاصی رونق ہے اور شہر کا پارک ب اور پُر رونق ہو گیا ہے۔ آوارہ گرد تو دن بھر یہاں دھماں چوکڑی مچاتے رہتے ہیں۔ ب شرفا بھی ہوا خوری کے لیے یہاں بال بچوں سمیت نکل آئے ہیں۔ سینماؤں کے باہر بھی و باش لوگ ہنگامہ ہائے رستاخیز مچا رہے ہیں۔ شراب خانے کھلے ہیں، رقص گاہیں رنگ و بو سے لبریز ہیں۔ ایک طرف غربت اور دوسری طرف تعیش۔ یہ ہے کوتا باتو کی دُنیا۔ چلتے چلتے اسی ل پہ آ گئے جہاں ہم دن کو گزر رہے تھے۔ اب یہاں تاریکی ہے۔ دُور جھونپڑوں کے اندر مدھم دھم سی روشنی جھلک رہی ہے۔ پُل عبور کرنے کے بعد ہم جس علاقے میں آ گئے ہیں وہ شہر کا حصہ ہیں معلوم ہوتا، بلکہ ایک پسماندہ سا قصبہ معلوم ہوتا ہے۔ لکڑی اور ناریل کے پتوں کے بنے ہوئے نیچی نیچی چھتوں کے مکانات۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی، غلاظت کے ڈھیر جگہ جگہ۔ گلیاں روشنی سے محروم۔ گھٹن اور حبس۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں میں عورتیں ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پنکھے لیے بیٹھی گاہکوں کو تاڑ رہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں اسی اندھیرے اور غلاظت کے ڈھیروں کے درمیان بچپن کا شوق پورا کر رہے ہیں۔ ہم اس وقت عبدالبیان کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔

"آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا" عبدالبیان بار بار اپنے فقر کا حوالہ دے رہا ہے۔ شاید وہ ہنی طور پر مجھے آمادہ کر رہا ہو کہ میں اُس کی کُٹیا کو دیکھ کر "کراہت" نہ محسوس کروں۔ ساتھ ہی اُسے خوشی بھی بہت ہے کہ میں اُس کے گھر جا رہا ہوں۔ میری نگاہیں تو ماحول اور اُس کی مسکنت یں کھُبی ہوئی ہیں۔ اور عبدالبیان کی زبان اس طرح کے فقرے برابر دہرائے جاتی ہے": میں ایک نادار انسان ہوں، کسی روز مزدوری مل جاتی ہے اور کسی روز خالی بیٹھا رہتا ہوں، دریا کے ندر ایک جھونپڑا بمشکل بنا سکا ہوں، اب وہاں اندھیرا ہو گا۔ مٹی کے دیے سے ہم کام چلاتے ہیں۔ مکان کی گلی میں تاریکی ہو گی۔ پانی بھی جگہ جگہ کھڑا ہو گا، ذرا سنبھل کر چلنا ہو گا۔ طٰہٰ اور جمیل بھی ساتھ ہیں۔ یہ دونوں بھی تقریباً عبدالبیان کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اب ہم اس گلی میں مڑ رہے ہیں جس کے آخری کنارے پر عبدالبیان کا مکان ہے۔ گلی کے دونوں طرف جھونپڑے ہیں جن کے صحن نہیں ہیں۔ مکین کھڑکیوں اور دریچوں میں بیٹھ کر باہر کی ہوا کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تیل کے چراغ تاریکی سے برسرِپیکار ہیں۔ تاریکی شدید ہے یا تیل کم، چراغ بجھے بجھے دکھائی دے رہے ہیں۔ ماحول پر سکوت طاری ہے۔ دل اور چراغ کی یہ دنیا شاعر نے خوب بیان کی ہے۔

ع
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

مجاہد کا گھر لیجیے یہ ہے عبدالبیان کا گھر۔ لکڑی کے ستونوں پر لکڑی کا فرش ڈال دیا گیا ہے۔ آدھے ستون دریا کے اندر نصب ہیں۔ اوپر چھت ناریل کے لمبے لمبے پتوں اور ٹہنیوں کو مضبوطی سے باندھ کر ڈالی گئی ہے۔ دیواریں بھی پتوں اور ٹہنیوں کی ہیں۔ آٹھ دس آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے ایک بیٹھک ہے۔ اندر شاید دو کمرے اور ہوں گے۔ بیٹھک میں لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ عورتوں نے کوشش کی ہے کہ مکان باہر سے نازیبا سہی اندر سے اسے خوبصورت بنایا جائے۔ دیواروں پر رنگدار پٹیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ گلدان رکھے ہوئے ہیں حرمین کی تصویر بھی آویزاں ہے۔ لکڑی بڑے سلیقے اور نفاست کے ساتھ تراشی گئی ہے۔

عبدالبیان کے آٹھ بچے ہیں۔ چھوٹے دو بچوں کے سوا باقی سب اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اسکول کی تعلیم گو فری ہے، مگر دیگر مصارف خاصے جان لیوا ہیں۔ یہ سارے بچے خاکسار کو الگ الگ آکر ملے۔ موم بتی کی روشنی میں چند لمحات تک یہ محفل جاری رہی۔ پڑوس کے لوگ بھی آکر ملنے لگے۔ عبدالبیان ہی کے ایک ہم خیال اور ہمراز طٰہٰ کا گھر بھی عبدالبیان کے گھر سے متصل ہے، وہ کہنے لگا کہ ایک قدم اِدھر بھی رکھ دیں۔ ان لوگوں کی محبت و عقیدت دیدنی ہے۔ طٰہٰ کا گھر عبدالبیان کے گھر سے ذرا ترقی یافتہ ہے۔ صرف اس معنی میں کہ طٰہٰ نے لکڑی کو پالش کر رکھا ہے۔ اور کرسیوں کا ڈیزائن بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں: جھونپڑا، مگر اچھا۔

بعد میں مجھ پر یہ راز کھلا کہ تینوں حضرات: عبدالبیان، طٰہٰ اور جمیل صاحب اعلیٰ درجے کے مجاہدین میں سے ہیں۔ جہاد میں سب کچھ لگا دینے کے بعد اب ان جھونپڑوں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ کچھ دیر تک عبدالبیان اور طٰہٰ کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد ہم واپس الکوراز ون چل دیئے۔ اس وقت سڑکوں پہ زیادہ روشنی نہیں ہے۔ جگہ جگہ لڑکوں اور لڑکیوں کے جھنڈ بیٹھے ہیں، سینما بھی چل رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اکثریت کی آبادی کے اس شہر کو دانستہ بگاڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

علماء کا تعاقب

میرے ساتھی کچھ خوف و ہراس محسوس رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ علماء و مجاہدین (جو اپنے لباس اور چال ڈھال سے پہچانے جاتے ہیں) رات کو سڑکوں پر نکلیں تو انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ کئی علماء جو اس طرح گرفتار کر لیے گئے تھے ابھی تک لاپتہ ہیں، شاید انہیں قتل کر دیا گیا ہو۔ مارکوس کی خصوصی پولیس رات کو شہر میں گشت کرتی رہتی ہے یہ پولیس پوری کی پوری عیسائی ہے اور وہ مسلمانوں سے انتقام لینے میں بڑی جری ہے۔

قرآن مجید میں مقامیت و آفاقیت

مہر محمد حسین، ایم اے - فاضل دیوبند - علماء اکیڈمی منصورہ لاہور

"قرآن مجید کے اس دعوے سے ہر کوئی واقف ہے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے آیا ہے لیکن جب کوئی شخص اس کو پڑھنے بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا روئے سخن زیادہ تر اپنے زمانۂ نزول کے اہل عرب کی طرف ہے۔ وہ اکثر ایسی باتیں کہتا ہے جو عرب ہی کے مذاق، عرب ہی کے ماحول، عرب ہی کی تاریخ اور عرب ہی کے رسم و رواج سے ربط و تعلق رکھتی ہیں۔ اس معاملے کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ شاید اس شک میں پڑ جائیں کہ قرآن دراصل اپنے ہم عصر اہلِ عرب کی اصلاح کے لیے تھا جس کی تعلیمات کو کھینچ تان کر عالمگیر بنا لیا گیا ہے۔" (تفہیم القرآن)

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی شیون و صفات، امکانِ قیامت اور اپنی قدرتِ کاملہ و واسعہ کے سلسلے میں جن آثارِ کائنات اور دیگر شواہد کا ذکر کرتا ہے۔ وہ ہیں مختلف رنگوں کے پہاڑ، تیز و تند ہوائیں، گرجتے برستے بادل، عجیب الخلقت اونٹ، دُور دُور تک پھیلی ہوئی زمین کی وسعتیں، حدودِ آفاق تک تنا ہوا نیلگوں آسمان کا شامیانہ، ٹوٹتے شہاب، دمکتے ستارے، گھٹتا بڑھتا چاند، ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے والا آفتاب، صبح و شام چراگاہوں کو جاتے اور واپس لوٹتے گایوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، میدانِ جنگ میں دوڑتے بھاگتے گھوڑے وغیرہ اور یہ سب کے سب ریگزار و کوہسارِ عرب کے مناظر ہیں۔ اسی

طرح جن امم سابقہ ـــــ قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوطؑ، قومِ شعیبؑ یا جن انبیاء کے حالات سے قرآن بھرا ہوا ہے، وہ بھی زیادہ تر تاریخ عرب ہی کی اقوام اور انبیا ہیں۔ بُت پرستی اور دوسرے مشرکانہ عقاید، انکارِ قیامت، دختر کشی، حلال و حرام کا خود ساختہ نظام، عائلی زندگی کی قباحتیں وغیرہ بھی وہی اوہام و ظنون اور وہی رسوم و رواج ہیں جو عربوں میں رائج تھے۔

ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ دُنیا کا کوئی فلسفہ اور کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جو از اوّل تا آخر تجریدی (ABSTRACT) انداز میں بیان کیا گیا ہو اور جس کی کسی متعین صورت یا حالت پر اس کو چسپاں کر کے توضیح نہ کی گئی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو وہ فلسفہ صرف صفحۂ کاغذ پر ہی جم کر رہ جائے گا۔ انسانوں کی زندگی میں جذب ہو کر عملی نظام میں تبدیل نہیں ہو سکتا۔

پھر کسی فکری و اخلاقی تحریک کو بین الاقوامی پیمانے پر پھیلانے کے لیے یہ بات کبھی مفید نہیں ہو سکتی کہ اُسے شروع ہی سے مکمل بین الاقوامی شکل میں پیش کیا جائے۔ اس کے نفاذ کا صحیح عملی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اُسے ایک خاص مُلک اور قوم میں نافذ کیا جائے۔ جس کے مزاج اور زبان اور عادات و خصائل سے اس کا داعی واقف ہو۔ اور یوں اس نظامِ زندگی کو عملاً چلا کر دُنیا والوں کو اس کی برکت و افادیت کا مشاہدہ کرا دیا جائے جیسا کہ نبی آخر الزمان نے عرب معاشرے میں ایسا کر کے دکھا دیا۔ اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید نے ہمیشہ انہیں یٰٓاَیُّھَا النَّاس۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا، یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ، یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کے الفاظ سے مخاطب کیا اور ان میں کوئی خطاب ایسا نہیں جو عربوں سے مخصوص ہو بلکہ ایک عام اور ہمہ گیر اندازِ خطاب ہے۔

پھر دیکھنا یہ ہے کہ جس قسم کے شرک و کفر، اخلاقی بُرائیوں اور اوہام پرستی میں عرب مبتلا تھے، کیا وہ انسانیت کی عالمگیر بیماریاں نہیں ہیں۔ دورِ حاضر کی آخر وہ کونسی فکری و عملی گمراہیاں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ عربوں نے اگر اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق و مالک تسلیم کرتے ہوئے اس کے بعض نیک بندوں کو اس کا بیٹا تصوّر کر لیا اور اُسے

اس کی صفات کا مظہر قرار دے کر ان کے سامنے بندگی و پرستش کے تمام مراسم بجالاتے تھے یا انہیں خدائے حقیقی تک رسائی کا ذریعہ سمجھ کر ان کی پوجا کرتے تھے تو آج دنیا کا وہ کونسا مذہب ہے جس میں یہ سب کچھ نہیں ہو رہا۔ حالت تو یہ ہے کہ قرآن مجید کی بار بار کی تردید و تغلیط کے باوجود خود مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت آج اسی طرح کے شرک میں مبتلا ہے۔

اگر اس وقت کے عربوں کا یہ خیال تھا کہ ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یھلکنا الا الدھر ۴۵/۲۴ اور من یحی العظام وھی رمیم ۳۶/۷۸ کہ ہماری یہ زندگی بس اسی دنیا تک محدود ہے۔ گردش دہر سے ہم مرتے اور مٹتے چلے جاتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کے بعد انسان دوبارہ زندہ ہو سکے۔ آخرت واخرت کوئی شے نہیں۔ تو کیا آج کا نام نہاد دانشور انسان بھی یہی نہیں کہتا کہ ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اور کیا وہ زبانِ حال سے پکار پکار کر نہیں کہہ رہا کہ ؏

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

خدا پرستی، صداقت اور نیکی کی دعوت دینے والوں کے متعلق اگر اس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ انؤمن کما امن السفھاء کہ کیا ہم بھی ان احمقوں کی طرح ایمان لائیں۔ تو کیا آج بھی ان اقدار کی دعوت دینے والوں کو "مذہبی دیوانے" تصور نہیں کیا جاتا۔

اگر اس وقت کا عرب رنگ و نسل کے امتیازات میں مبتلا تھا تو آج کے ہندوستان، جنوبی افریقہ بلکہ کل تک کے امریکہ کو دیکھ کر بتایئے کہ کیا آج کا انسان ان سے بھی زیادہ رنگ و نسل اور ذات پات کے تعصبات میں گرفتار نہیں اور کیا قرآن مجید میں دیا گیا مساواتِ انسانی کا یہ پیغام کہ یایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ آج کی دنیا کے

لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔
عرب اگر کاروبار میں ہیراپھیری کرتے اور ڈنڈی مارتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ دین و مذہب کو ہمارے اس آزاد کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے تو کیا آج کی کاروباری دنیا میں ایسا نہیں ہو رہا۔ اور کیا آیۃ ویل للمطففین ...... الخ اپنے اندر ان کے لیے کوئی انتباہ نہیں رکھتی۔
عورت کی عصمت اگر اُس وقت کاروبار کی چیز تھی تو اب اُس سے بڑھ کر اس کا مول تول ہو رہا ہے۔ اس لیے آج بھی ضرورت ہے کہ اس گھناؤنے جرم پر الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ کی رو سے کڑی سزائیں دی جائیں اور اس مکروہ کاروبار کی تمام راہیں مسدود کر دی جائیں۔
بعض طبائع تو شاید اس امر پر ناک بھوں چڑھائیں کہ قرآن نے قوم لوطؑ کے ایک انتہائی مکروہ کردار ——— ہم جنسیت ——— اور اس پر اُن کی تباہی کو ریکارڈ کیا۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ حالانکہ قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی یہی کافی شہادت ہے، کیونکہ خدائے علیم و خبیر کو علم تھا کہ "چہرہ روشن اندروں تاریک تر" رکھنے والی مستقبل کی تہذیب میں نہ صرف یہ کہ اس قبیح جرم کا ارتکاب کیا جائے گا، بلکہ اس کو باقاعدہ قانونی جواز بھی مہیا کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ چند سال پیشتر تہذیب جدید کے علمبردار ملک جرمنی کی ریشتاغ میں اور ابھی حال ہی میں برطانیہ میں ہو چکا ہے۔ اور امریکہ سمیت مغربی ممالک میں ایسے ننگِ انسانیت لوگوں کی باقاعدہ تنظیمیں وجود میں آ چکی ہیں جو اِس جرم کا ارتکاب ڈنکے کی چوٹ کرتی ہیں بلکہ اپنی حکومتوں سے اس کو تحفظ دینے کے مطالبے کی غرض سے پچاس پچاس ہزار افراد پر مشتمل جلوس نکالتی اور مظاہرے کرتی ہیں۔
الغرض ہمیں قرآن میں بیان کردہ کوئی ایسی عملی و اعتقادی گمراہی نظر نہیں آتی جو دنیا کی مختلف اقوام میں اب بھی موجود نہ ہو اور جو صرف اس دور کے عربوں ہی سے مخصوص ہو۔ اِسی طرح قرآن مجید نے جن اعلیٰ اصولوں اور پاکیزہ اخلاق کی دعوت دی ہے وہ بھی ہرگز ایسے نہیں کہ وہ صرف عربوں ہی کے مزاج، معاشرے اور دور سے مخصوص ہوں۔

بلکہ وہ پوری انسانیت کے لیے امن و سکون اور فوز و فلاح کے موجب ہیں۔
جن مناظرِ فطرت کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ و واسعہ اور امکانِ قیامت پر دلیل و شاہد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے وہ بھی عالمگیر نوعیت کے ہیں۔ چونکہ قرآن مجید کے مخاطب جہاں متمدن و ترقی یافتہ انسان ہیں وہاں مٹی کے گھروندوں یا کھلے آسمان تلے خیموں یا جنگلوں کے باسی بھی ہیں، اس لیے ایسے مناظرِ فطرت سے استشہاد کیا جن سے شہری و دیہاتی، ترقی یافتہ و غیر ترقی یافتہ، جاہل و عالم، یورپین و افریقی، کوہستانی و صحرائی تمام انسانوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ آخر دنیا کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے دن سورج کی روشنی اور جس کی راتیں چاند اور ستاروں کی چاندنی سے نہ جگمگاتی ہوں اور وہ کونسا متمدن سے متمدن ملک ہے جہاں کے انسان انھی ہواؤں میں سانس لے کر نہ جی رہے ہوں، جو کبھی تیز و تند طوفان کا روپ دھار لیتی ہیں اور کبھی نسیم جاں فزا کے جھونکے بن کر روحوں میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ اس مشینی دور میں بھی جانور انسانوں کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اور انتہائی ترقی یافتہ ممالک کے لوگ بھی گھوڑوں، گایوں اور بھیڑ بکریوں کے گلّے کے گلّے غذائی و تجارتی مقاصد کے لیے پالتے ہیں، جن کی چراگاہیں اور باڑے —

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۱۶/۶
صبح و شام ان جانوروں کو لانے لے جانے وقت ایک دلکش منظر تمہارے سامنے ہوتا ہے۔

کا ایک حسین نظارہ لیے ہوئے ہیں۔

اسلام کا نظامِ شہادت

جناب حکیم شیخ محمد عبد الواحد صاحب ۔ سیالکوٹ

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں قرآن حکیم صرف تلاوت کرنے کی کتاب ہی تصور نہیں کی جاتی تھی، بلکہ وہ مسلمانوں کی دینی، اخلاقی، قانونی، اقتصادی، معاشی یہاں تک کہ سیاسی اقدار کے لیے بھی مشعلِ راہ تھی۔

اِسی کتاب کی عظمت و برکت نے قیصر و کسریٰ جیسی اپنے زمانہ کی بڑی طاقتوں کو سرنگوں کیا۔ مسلم شریف میں حدیث آئی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهَا آخَرِينَ۔ اللہ تعالیٰ اسی کتاب کے ذریعے کچھ لوگوں کو ارفع مقام سے نوازتا ہے اور اسی سے دوسروں کو سرنگوں کر دیتا ہے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی عزت و عظمت اُس دور میں پورے اقوامِ عالم میں صرف اس لیے تھی کہ اُن کا دستورِ عمل صرف اور صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل تھا۔

آج جب ہمارا تمام نظامِ حیات غفلت و معصیت کا شکار ہے تو اُس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔

ہم اسلام کا نام تو بہت لیتے ہیں لیکن اسلام پر عمل بہت کم کرتے ہیں یا کرتے ہی نہیں۔ حدیث میں آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یاتی علی الناس زمانٌ

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ۔ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب کہ اسلام کا صرف نام ہی باقی رہ جائے گا اور قرآن کے صرف نقوش ہی رہ جائیں گے۔ (بیہقی۔ مشکوٰۃ)

یا ہم نفاذِ اسلام کا مطالبہ کرتے ہیں تو اُس میں یہ تمنا رکھتے ہیں کہ اسلام ملک کے تمام باشندوں پر نافذ ہو جائے صرف مجھے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے تو ایسی تمنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً ۝ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ) ۔ یہ ہرگز درست نہیں کہ اپنے مفاد کی خاطر کچھ کو مان لیا اور کچھ کا انکار کر دیا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۝

اسلام نے قانونِ شہادت کو بھی واضح طور پر بیان کیا ہے، کیونکہ شہادت پر ہی اکثر و بیشتر فیصلہ کا انحصار ہوتا ہے۔ شہادت کا نصاب مختلف مقدمات میں مختلف ہے۔ جبکہ مروجہ برطانوی قانونِ شہادت میں شہادت کا کوئی نصاب نہیں۔ سوائے اس کے کہ دو گواہ ہوں۔ مرد اور عورت کی کوئی تمیز نہیں۔ مسلمان و کافر کی کوئی قید نہیں۔ فوجداری و دیوانی کی کوئی رعایت نہیں۔ معاملات و عبادات کی کوئی تفریق نہیں اور گواہ کے لیے عادل و صالح ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ بس صرف اور صرف دو گواہ ہوں۔

یہ قانونِ شہادت برصغیر پاک و ہند میں غالباً ۱۸۷۲ء میں نافذ کیا گیا اور آج ہم سب اس کے تحت ایک سو گیارہ سال سے اپنے مقدمات کے فیصلے کرا رہے ہیں۔ اِس قانون شہادت میں یہ قابلِ ذکر نکتے ہیں:

ایک عورت کی شہادت ایک مرد کے برابر۔ دو عورتوں کی شہادت دو مردوں کے برابر۔

ایک نیک عورت کی شہادت ایک فاحشہ عورت یا بدکار مرد کے برابر۔ ایک نیک مرد کی شہادت ایک فاحشہ عورت یا بدکار مرد کے برابر۔ ایک مسلمان مرد یا عورت کی شہادت ایک کافر مرد یا عورت کی شہادت کے برابر۔

اُس قانون کے نقائص بہت زیادہ ہیں لیکن سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ کرایہ کے گواہوں

کا بازار گرم رہتا ہے۔ اور شہادت کو بطور تجارت اپنایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انصاف بکتا ہے۔ بغض، حسد، کینہ اور عداوت پھیلتی ہے۔ اور جب انصاف آسانی سے میسر نہیں آتا تو ظلم و ستم کا لامتناہی دور شروع ہو جاتا ہے۔ باپ کا دائر کیا ہوا مقدمہ پوتے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یا جب فیصلہ سنایا جاتا ہے تو مدّعی قبر میں پہنچ چکا ہوتا ہے۔

اب لیجیے اسلام کے قانونِ شہادت کو، جسے قرآن نے بتایا اور حدیث نے سمجھایا۔ شریعتِ مقدسہ اسلامیہ نے ثبوتِ جرم کے لیے گواہوں کا نصاب مقرر کیا ہے۔ جب تک نصاب پورا نہ ہوگا۔ اس وقت تک اُسے ثبوت کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ نصابِ شہادت کا مسئلہ اجتہادی مسئلہ نہیں ہے جس میں اختلاف کی گنجائش ہو بلکہ یہ قرآن و سنّت کی واضح تعلیمات سے ثابت ہے۔ اگر کسی مقدمے کا فیصلہ شریعتِ مقدسہ اسلامیہ کے مطابق کرنا ہے تو اس کے لیے مقررہ نصابِ شہادت کا پورا کرنا لازمی اور از حد ضروری ہے۔

نصابِ شہادت کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں:۔

۱۔ صرف زنا سے متعلق شہادت کا نصاب۔

۲۔ زنا کے بعد باقی حدود اور قصاص میں شہادت کا نصاب۔

۳۔ عام معاملات اور حقوق میں شہادت کا نصاب۔

۴۔ مخصوص نسوانی معاملات میں شہادت کا نصاب۔

۱۔ زنا کے لیے نصابِ شہادت فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (اور تمہاری بیویوں میں سے جو عورتیں بدکاری کی مرتکب ہوں تو تم ان عورتوں کے خلاف اپنوں میں سے چار مردوں کی گواہی لاؤ)۔ سورۂ نساء آیت ۱۵۔

اس آیت کریمہ میں مندرجہ امور کی تصریح ہوگی:

ا۔ ثبوت زنا کے لیے چار مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

ب۔ چاروں مردوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔

ج۔ چار مردوں سے کم یا تین مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے بھی نصابِ شہادت مکمل نہیں ہوگا۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥

(اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ اپنے دعوے پر نہ لا سکیں۔ تو ایسے لوگوں کو اسی دُرّے مارو اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ اور یہ لوگ فاسق ہیں)۔ سورۂ نور آیت ۴

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کا الزام لگانے والے کو حکم دیا ہے کہ:

اِئْتِ بِاَرْبَعَةٍ يَشْهَدُوْنَ عَلٰى صِدْقِ مَقَالَتِكَ وَاِلَّا فَحَدٌّ فِيْ ظَهْرِكَ۔

(ایسے چار آدمی لاؤ جو تمہارے بیان کی صداقت پر گواہی دیں، بصورت دیگر تمہاری پیٹھ پر دُرّے لگائے جائیں گے (کتاب الفقہ جلد ۵ ص ۱۲۲)۔

تو ایسے لوگوں کو حدِ قذف کی سزا دی جائے گی۔ اور ان کی گواہی سے زنا ثابت نہیں ہوگا۔ شریعتِ مقدسہ اسلامیہ نے جس طرح چار مردوں سے کم کی گواہی کو قبول نہیں کیا ایسے ہی مطلقاً عورتوں کی گواہی کو بھی قبول نہیں کیا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ عورتوں کی حق تلفی ہوئی ہے۔ بلکہ اسلامی شریعت نے صنفِ نازک کو عدالتی جرح و تعدیل میں پڑنے سے محفوظ فرمایا ہے۔ اور خصوصاً آج کل گواہوں کی جرح کے سلسلے میں جو جو غلیظ اور ناقابلِ بیان نکات اٹھائے جاتے ہیں اور عینی شہادت کے جو اُلٹے سیدھے سوالات کیے جاتے ہیں اُن سے عورت کو بالکل آزاد اور الگ تھلگ رکھا گیا ہے۔ جس سے عورت کی عزت و عفت اور شرم و حیا عام پبلک میں نشر نہیں ہوتی۔ جب کسی عورت کا بیانِ شہادت ہوتا ہے تو عدالت کے اندر و باہر مقدمے کی سماعت کے لیے ہجوم برپا ہو جاتا ہے۔ اخبارات کے اندر خوب زوردار خبریں شائع ہوتی ہیں۔ غور فرمائیے اسلام نے

معاشی طور پر جس معاشرے میں محرومیاں، ناہمواریاں، دکھ درد اور گلے شکوے پائے جاتے ہوں، وہ جارحیت کاروں کے لیے مضبوط قلعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ہاں سب سے بڑی بلائے بے درماں جاگیرداری اور وڈیرہ ازم ہے۔ دو بار "زرعی اصلاحات" کا شور رہا، مگر کوئی مردِ کار یا گروہِ عزیمت مند ایسا نمودار نہ ہوا جو اس قوتِ غارت گر کے گڑے ہوئے پنجوں کو معاشرے کی گردن سے الگ کر سکے۔ جاگیردار اور وڈیرے ایک طرف [illegible] پال رکھتے ہیں اور جرم و جفا کا ہنگامہ گرم رکھتے ہیں، پھر اپنی اس تخریبی قوت کے ساتھ اپنی دولت کے زور کو ملا کر خوشامدانہ انداز سے اربابِ جاہ کو رام کرتے ہیں۔ [illegible] باقی بے بہرہ کر لیں، سو اپنے دوسرے رسوخ کے ذریعے ان کو ایسے ذاتی ملازمین میں بدل لیتے ہیں جو ان کے اشارہ ابرو پر حکومت کے قوانین، ضوابط، مقاصد اور منصوبوں کا بھی حلیہ بگاڑتے ہیں اور عوام کو بھی ان کے سامنے کالانعام بنا دیتے ہیں۔ پھر ان جاگیرداروں وڈیروں کے الگ الگ جتھے بن جاتے ہیں۔ اور یہ جتھے آپس میں قوت آزمائی کرتے ہوئے زیروزبر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جاگیرداروں اور وڈیروں کا ایک بڑا حربہ یہ بھی ہے کہ یہ آس پاس کے مزاروں اور درگاہوں کو مرکزِ عقیدت بناتے ہیں۔ اور گدی نشینوں اور مجاوروں کا خوب پیٹ بھرتے ہیں۔ اپنے دائرہ اثر میں علماء (خصوصاً چھوٹے چھوٹے خطیبوں اور اماموں) کو استعمال کرتے ہیں۔ [illegible] پوری طرح مسخر نہ ہوں ان کو نہ کھل کر کام کرنے کا موقع دیتے ہیں، نہ حق بات کہنے کا اذن۔ اس طرح جاگیرداریوں اور وڈیروں کی جابجا سلطنتیں (سلطنت در سلطنت) قائم ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ لوگ ووٹوں کی منڈی کے آڑھتی بن کر بیٹھتے ہیں اور یا تو خود انتخابات میں آتے ہیں یا اپنے مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اور اصلاح و تعمیر چاہنے والی ہر شریف و دیانت دار قوت کا راستہ مسدود کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں سیاست و جمہوریت کا حلیہ جس طرح بگڑا ہے اس میں بہت بڑا حصہ جاگیرداروں اور وڈیروں کا ہے۔ سندھ کی خرابیٔ احوال کی ذمہ داری خاصی بڑی حد تک ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے۔ اس سیاست بگاڑ، اخلاق شکن اور خیانت آموز قوت کا زور توڑے بغیر پاکستان صلاح و فلاح سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

کو گواہ کر لیا کرو۔ اور اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو جن گواہوں کو تم قابلِ اطمینان سمجھ کر پسند کرو۔ ان میں سے ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہو جائیں تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔

اس آیت کریمہ سے مندرجہ ذیل اُمور کی تصریح ہو گی:

ا۔ عام معاملات میں بھی اوّل تو دو مرد ہی گواہ ہوں۔

ب۔ بصورتِ دیگر ایک مرد اور دو عورتیں ہو سکتی ہیں۔

ج۔ چار عورتیں نہیں ہو سکتیں۔

د۔ ایک مرد کا ہونا ضروری ہے۔ دوسرے مرد کے بجائے دو عورتیں ہوں گی۔

ہ۔ دونوں عورتوں کی گواہی اکٹھی ہو گی تاکہ اگر ایک بھولے تو دوسری اُسے یاد کرا دے۔

عام معاملات میں خواہ وہ معاملات مالیہ ہوں یا ازدواجی ہوں یا عائلی مثلاً نکاح و طلاق وغیرہ۔ ان میں اجماعِ اُمت ہے کہ ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہو گی۔ قرآن پاک میں وراثت کے معاملے میں عورت کو مرد کے مقابلے میں نصف حصّہ دینے کا حکم دیا ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ

(اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ترکہ کی تقسیم میں مرد کا حصّہ دو عورتوں کے حصّے کے برابر ہے) نساء آیت ۱۱

مندرجہ بالا تفصیل کے تحت عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے برابر قرار دینا واضح طور پر نصِ قرآنی، ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فرمودات صحابہؓ اور اجماعِ اُمت کی تحقیر ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

۴۔ مخصوص نسوانی معاملات میں نصاب شہادت

عورتوں کے نجی اور مخصوص معاملات مردوں کی نظروں سے عموماً پوشیدہ رہتے ہیں۔ جن کی اطلاع مردوں کو نہیں ہوتی یا نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک عورت کی گواہی ہی کافی ہوتی ہے اور اسے معتبر قرار دیا گیا ہے۔ اس

کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

ا — بچے کی زندہ یا مردہ پیدائش کی شہادت میں صرف ایک عورت (دایا) کی گواہی کافی ہے کہ بچے نے ایک سانس بھی لیا ہے، رویا ہے یا چیخ ماری ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کا غسل، تجہیز و تکفین، نمازِ جنازہ اور باقاعدہ قبر کھود کر دفن کرنا ضروری ہوگا، وگرنہ صرف ایک کپڑے میں لپیٹ کر گہرے گڑھے میں دفن کرنا ہوگا۔ موجودہ دور میں جب ہسپتالوں میں بچوں کی پیدائش ہوتی ہے تو صرف ایک لیڈی ڈاکٹر کی شہادت ہی معتبر ہے جس نے کیس کیا ہے کہ اس عورت کے ہاں لڑکا ہوا ہے یا لڑکی، زندہ یا مُردہ۔

ب — بلوغت کی شہادت میں بھی صرف خود عورت کی اپنی گواہی معتبر ہے کہ مجھے حیض آتا ہے۔ یا صرف ایک لیڈی ڈاکٹر کی شہادت کہ یہ بالغ عورت ہے، جس نے اس کا طبی معائنہ کیا ہو۔

ج — عورت شادی شدہ ہے یا کنواری اس کی بھی صرف ایک لیڈی ڈاکٹر کی شہادت معتبر ہے جس نے اس کا طبی معائنہ کیا ہو۔

د — رضاعت میں اپنے بچے کو دودھ پلانے کی مدت کا حساب کرنا ہو یا اپنے بچے کے سوا کسی اور بچے کو غلطی سے یا جان بوجھ کر دودھ پلایا ہو تو اس سے رضاعی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتائج نکاح کی حرمت و حلت میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس میں صرف ایک عورت کی گواہی معتبر ہے۔

ھ — عدت کے بارے میں خواہ طلاق کی عدت تین حیض ہوں یا شوہر کے فوت ہو جانے کے بعد عدت چار ماہ دس دن ہوں۔ اس میں بھی صرف ایک عورت بلکہ خود اس کی اپنی گواہی معتبر ہوگی۔

کچھ وسوسے اور اندیشے بیان کیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی عورت اکیلی ہو تو اس سے کوئی مال لوٹ کر لے جائے یا اس کا بچہ چھین کر چلا جائے تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ یہ تو سراسر غلط ہے کہ اس کی اِس حق تلفی کا مداوا نہیں ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں عورت گواہ نہیں مدعیہ ہوگی۔ اور وہ ڈاکو مدعیٰ علیہ ہوگا۔ اگر مدعیہ موقع کا کوئی گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ پر قسم ہوگی

جس کی باقاعدہ تفصیل قرآن و سنت کی روشنی میں موجود ہے اور علمائے حق سے دریافت کی جاسکتی ہے۔

عورت کی شہادت کے سلسلے میں سب سے بڑی دلیل حضرت سیدہ خدیجہ طاہرہؓ کی سب سے پہلے ایمان لانے کی شہادت دی جاتی ہے۔ یہ غور فرمایئے کہ یہ شہادت کسی عدالت میں سیدہ خدیجہ طاہرہ نے نہیں دی تھی، بلکہ حضورؐ کی نبوت کی تصدیق کی شہادت تھی۔ پھر خدانخواستہ اگر وہ شہادت نہ دیتیں تو حضورؐ کی نبوت میں کچھ فرق نہ پڑتا۔ جیسے سیدنا نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کی تصدیق نہ کرنے کے باوجود وہ دونوں اللہ کے نبی تھے۔ ان کی نبوت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس ایمانی شہادت میں اب بھی مرد و زن کو وہی الفاظ اور انداز اختیار کرنا لازمی ہے جو ایمان لانے کے لیے کلمۂ طیبہ یا کلمۂ شہادت کے لیے ہوتا ہے جس میں مرد اور عورت کی کوئی تمیز نہیں پوری یکسانیت ہے اور یہ شہادت ایمان کی شہادت ہے۔ معاملہ کی نہیں۔

رہی بات سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی کہ ان کی معرفت شریعت مقاصہ کا بیشتر حصہ اور اہم مسائل اُمت کے سامنے آئے اور سب نے قبول کیے۔ یہ بھی عدالت میں شہادت نہیں بلکہ اُمت کے سامنے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مسائل کی شہادت ہے۔ اس کے لیے مرد یا عورت کی قید نہیں۔ صرف مسلمان ہونے کی قید ہے اور اس کو محدثین کرام کی اصطلاح میں شہادت نہیں روایت کہتے ہیں۔

(بقیہ اشارات) صحافت ایک اور بڑی قوت ہے جو دفاعی ضرورت کے لیے ذہنی محاذ کو تیار کرتی ہے۔ صحافت کا وظیفہ خبر رسانی سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ حالات و واقعات کے تجزیہ کی مدد سے قوم کی معلمانہ اور مربیانہ خدمات انجام دیتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں صحافت ایک انڈسٹری اور کاروبار بن گئی ہے، اور جو اخبارات و جرائد معلمانہ فریضہ انجام دیا کرتے تھے وہ بھی مسابقت کی لپیٹ میں آکر فروخت اور آمدنی بڑھانے کے مروجہ حربوں کو اختیار کر چکے ہیں۔ ہمارے اخبارات نے ایک تو جنرل اسٹور کا سا پیرایہ اختیار کر لیا ہے، یعنی سیاسی افکار، واقعات و احوال کی عکاسی اور قوم اور خصوصاً غربا کے روزمرہ مسائل و مصائب کو پیش کرنے کے ساتھ سائنسی معلومات اور علوم نجوم، طب و معالجہ، باورچی خانہ اور دسترخوان کے مسائل، کشیدہ کاری اور فیشن کی تعلیم، کھیل کود اور شو بزنس کے احوال، فقہی مسائل[1] پر بحث و مذاکرات، خواتین اور بچوں کے لیے خاص صفحات (یا ایڈیشن) ادب کے گلدستہ ہائے نوبنو، تنقید و تبصرۂ کتب کے مختلف دائروں کو زیرنگیں لے کر ہیچ رنگی اور ہفت رنگی کا ایک ایسا مزاج پیدا کر لیا ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن بار بار ادھر سے اُدھر مڑتے ہیں۔ پھر اہم دینی اور قومی معاملات میں دعوے اور جواب دعوے اور اُن کے ردّ، پھر اُن کی کاٹ کا ایک ایسا سلسلہ جاری رہتا ہے کہ کسی معاملے میں قارئین کی کوئی ٹھکی ہوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ ایک انتشارِ مسلسل ذہنوں کا مقدر بن جاتا ہے۔ بغیر اشخاص کی علمی یا اخلاقی سطح کا لحاظ کیے ہر قسم کی الم غلم چیزیں اس طرح لائی جاتی ہیں، گویا یہ بڑے بڑے نتائج تحقیق و کاوش ہیں۔ ہر "ہاؤ ہو" کرنے والے کے لیے میدان کھلا ہے۔

ایک وبا عورتوں کی بڑی بڑی تصاویر (پوری آراستگی و پیراستگی کی شان کے ساتھ)

---

[1] قربانی، عقیقہ اور ولیمہ سے لے کر پردے اور قصاص و دیت کے مسائل تک کے لیے اخباری کالموں میں دارالافتا اور دارالمباحث کھلے ہوئے ہیں اور اخبار نویس ہر متکلم کو مسند افتا پر بٹھا دیتے ہیں۔

کھی پنے کی ہے۔ عموماً خصوصی اوراق کے پہلے صفحے پر چار چار عورتوں کی تصاویر آتی ہیں۔ پھر ایک نیا سلسلہ "میاں بیوی آمنے سامنے" کا ایسا چلا ہے کہ جیسے کسی گھر کی دیواریں ڈھا کر اور پردے چلمنیں ہٹا کر لوگوں کی بھیڑ کی بھیڑ کو اندر گھسا لایا جائے اور ان کو دکھایا بتایا جائے کہ شوہر صاحب کے کیا اطوار ہیں اور بیگم صاحبہ کی کیا ادائیں ہیں۔ بے پردگی کی بڑھتی ہوئی وبا کو تیز کرنے کا بڑا موثر راستہ نکالا گیا ہے۔ پھر ایک ستم یہ ہوا کہ اب فلمی ستاروں اور ریڈیو ٹی وی کے اداکاروں اور اداکاراؤں اور موسیقاروں اور موسیقاراؤں کے متعلق تبصرے اور انٹرویو ہی نہیں، خبروں کے صفحات میں باقاعدہ خبریں شائع ہونے لگی ہیں[1] کہ فلاں نے شادی کر لی اور فلاں کے ہاں ولادت ہوئی اور فلاں اور فلاں میں اَن بَن ہو گئی ہے یعنی اشتہاروں کے پردے سے نکال کر اس طبقے کو خبروں کے اسٹیج پر جگہ دے دی گئی ہے۔

پھر صحافت کو سرخی پاؤڈر لگانے کی دوڑ ہے۔ کسی زندہ و توانا ملک کے قومی اخبارات اِس بازاری انداز سے پیش نہیں کیے جاتے، مگر ہمارے ہاں کاروباریت کے سامنے صحافت نے ماتھا ٹیک دیا ہے۔

ادب کا بھی حال عجب ہے۔ قومی یا دینی بنیادوں پر کوئی مرکزی نظریہ و نصب العین نہیں ہے جو نثر نویسوں اور نظم نگاروں کے ذہنوں میں رچ بس کر ان میں کسی قدر ہم آہنگی پیدا کرے اور اپنے تہذیبی، سیاسی اور دفاعی تقاضوں کے لیے تعمیری رجحانات دے سکے۔ شہرت کا ایک راستہ ہے جس پر بڑے ادیبوں کے پیچھے چھوٹے ادیب بھی دوڑ رہے ہیں اور اپنی کاوشوں کو ہاتھوں میں لیے اُن کی رُونمائی کے لیے تلاش محفل میں ہیں۔ ادبی کتابوں کے لیے باراتِ نشستہ کا انتظام کیا جاتا ہے اور اس میں چند ممتاز ہستیوں سے تعریفی جملے کہلوائے جاتے ہیں۔ بیچارے اکابر اس لیے مارکیٹ کی اس مانگ کو پورا

---

[1] راقم نے ایک دن کے کسی اخبار میں بسا اوقات چار چار ایسی خبریں خبری صفحات میں باقاعدہ نمایاں سرخیوں کے ساتھ پڑھی ہیں۔

کرتے ہیں کہ خود انہیں بھی تو چھوٹے بڑے ادیبوں میں سے اپنے لیے گاہک، قارئین، ناقد اور تحسین کار چاہئیں۔ یہاں تو سودا نقد ہے کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔

اکابرین ادب کی ایک بڑی تعداد کے یہاں نظریۂ الحاد، سیکولر ذہنیت، اوپن سوسائٹی، بے پردہ معاشرت اور اشتراکی نظام کا پروپیگنڈا تو نگارشات میں رچا بسا ملتا ہے، مگر یہی بات اگر اسلام کے متعلق چاہی جائے تو اعتراض یہ ہے کہ اس طرح تو ادیب کی آزادیٔ ضمیر ماری جائے گی۔ جن مستعار مغربی نظریاتِ ادب و تنقید کی غذا سے ذہنوں کی پرورش ہوتی ہے وہ اپنے اندر اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھتے۔ اپنا نظریۂ ادب و تنقید کوئی ہے ہی نہیں کہ جسے بنائے فکر و بحث اور معیارِ فیصلہ بنایا جا سکے۔

ادب و صحافت کے دو بڑے فکری سرچشموں کا گدلا پن قوم کے نوجوانوں میں اسلامی جہاد کے ذوق کو پنپنے ہی نہیں دیتا۔ اگر ہمیں کسی چیلنج کا سنجیدگی سے جواب دینا ہے تو ان فکری سرچشموں کی تطہیر کا انجام کرنا ہوگا۔

حضرات علماء کا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ناخوشگواریٔ احوال کے بعض ایسے پہلوؤں پر نظر ڈالنا ضروری ہے، جن کی ذمہ داری اس معزز طبقے پر عاید ہوتی ہے۔

یہ اہم طبقہ جس کے گراں مرتبہ ۳۳ نمائندوں نے جمع ہو کر تمام مکاتبِ فکر کی جانب سے ۱۹۵۱ء میں ۲۲ دستوری اُصول بالاتفاق پاس کیے تھے، جس کے متعدد اکابر نے مل کر ۱۹۵۴ء کے مسودۂ دستور کے متعلق متفقہ طور پر تفصیلی دستوری ترمیمات طے کی تھیں۔ جس نے عائلی قوانین کے خلافِ شریعت پہلوؤں کے خلاف یک آہنگی سے آواز اٹھائی تھی۔ اور جس نے دَورِ ایوبی میں رویتِ ہلال تک کے مسئلے میں اجتماعی رویہ اختیار کیا تھا، اب یہ ایسے مقام پر آ گرا ہے کہ اس کے لواحقین بڑے بڑے خلافِ شریعت فتنوں کے خلاف — خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی، معاشرتی یا قانونی، مل بیٹھنے کے روادار نہیں

ہیں۔ مدت بعد قصاص و دیت[1] کے مسئلے پر چند ممتاز علماء نے اکٹھے ہو کر ایک متحدہ موقف اختیار کر کے بیان دیا ہے۔ ع

پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را

پچھلے چند سال سے مسجدوں اور مدرسوں میں فرقہ وارانہ معرکہ آرائی کے مورچے بن گئے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر توپوں اور مشین گنوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ باہمی تکفیر و تفسیق بھی چلتی رہے، تقریروں کا ٹکراؤ بھی ہوتا ہے۔ پمفلٹ بازی بھی جاری ہے۔ نتیجہ یہ کہ تاریخی واقعات اور فقہی مسائل کے اختلاف پر مبنی گروہ بندیوں نے ایک طرف کے مسلمان اور دوسری طرف کے مسلمان میں ایسی مغائرت پیدا کر دی ہے کہ جیسی کافر و مسلم میں ہوتی ہے۔ ان میں باہمی رشتے نہیں ہو سکتے اور ایک جگہ نماز پڑھنے کی رواداری نہیں ہے۔ ان گروہ بندیوں کے سالاروں نے پوری ملت کو پھاڑ کے رکھ دیا ہے۔ پچھلے دنوں جو سانحہ لاہور کی بادشاہی مسجد میں ہوا، اور اب جو اذیت ناک تصادم کراچی میں ہوا ہے اُس نے تمام اہلِ احساس کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اب یہ بات عام طور پر سمجھ میں آنے لگی ہے کہ فرقوں کی یہ بڑھتی ہوئی معرکہ آرائیاں سیاست اور انتخابات کے لیے بھی خطرناک ہیں، عام ترقی کے لیے بھی مضر ہیں اور دفاع کے لیے ہلاکت انگیز ہیں۔

---

[1] افسوسناک معاملہ یہ ہے کہ برسرِ عام اخباری صفحات پر علماء اس مسئلے پر متحارب ہونے سے پہلے اگر ایک روزہ یا سہ روزہ مشاورت کر لیتے اور تمام گروہوں کے نمائندہ دس بیس حضرات ایک مشترکہ موقف اختیار کر لیتے تو علماء کے وزن اور ان کی قوت میں اضافہ ہوتا۔ مگر ایسا اس لیے نہ ہو سکا کہ ایک طرف کچھ لوگ حکمران کے عزوں کو پڑھ کر اپنے افکار کو ترتیب دیتے ہیں۔ کچھ کو خواتین کے زلف دابرو کا لحاظ ہے جب کہ کچھ دوسرے اصحاب کو ان کے ووٹوں کی فکر بھی ہے۔ کچھ اور ہیں جو شہرت کے بلندتر اسٹیج کی روشنیوں کے سیلاب میں جلوہ فگن ہونا چاہتے ہیں، جیسے کہ ایک نوخیز حضرت نے ایک پرانے سکہ بند عالم سے یہ کہا کہ آپ بھی عورت کی دیت کو مرد کے برابر قرار دیں تو "واہ وا" ہو جائے گی۔

پھر بات اندرونِ وطن تک ہی محدود نہیں، بلکہ تفرقہ کے یہ سوداگر دنیا کے ہر اُس گوشے میں پہنچتے ہیں جہاں تارکِ وطن پاکستانی معاشی تنگ و تاز کے ساتھ دین کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ ان سوداگرانِ تفرقہ کے جانے سے پہلے تمام فرقوں کے لوگ غیر مسلم معاشروں میں مل جل کر اپنے دینی اور ثقافتی زندگی کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام بھی کرتے چلے آرہے تھے۔ مگر یہ جہاں پہنچے وہاں انھوں نے اتحاد کی صفوں کو پھاڑ دیا۔ فرقے از سرِ نو بحال کر دیئے اور مسجدوں کو اکھاڑا بنا دیا۔ یہاں تک کہ متنازعہ مسجدوں پہ تالے لگ گئے اور پولیس کے پہرے بیٹھ گئے۔ ان حضرات کو اس بات پر شرم بھی نہ آئی کہ اُن کے اپنے ملک میں شدید اختلاف رکھنے والی عیسائی مشنریاں بیک وقت کام کر رہی ہیں۔ اور ان میں کبھی کوئی تصادم اور مناقشہ نہیں ہوا۔ لیکن مسلمانوں کے متقی واعظوں کا یہ شاندار کارنامہ ہے کہ انھوں نے کفار کے ممالک میں جا کر یہ تماشا دکھایا کہ مسلمان اور مسلمان دین کے نام پر لڑ رہا ہے۔

اتحاد کی بات ہو تو یہ حضرات اتحادِ ملت پر بہت شاندار وعظ بھی کہتے ہیں، مگر اپنے وعظوں ہی کے ذریعے ایسے لفظی نشتر بکھیرتے ہیں جو دلوں کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ محترم ہستیاں چیلنجوں سے گھری ہوئی قوم کو جہاد کے لیے تیار کریں اور عوام خصوصاً نوجوانوں کو صفِ واحد میں لا کر بنیان مرصوص بنا دیں، انھوں نے دشمن طاقتوں کے لیے ملّی زندگی کے قلعے میں شگاف اور دراڑیں پیدا کر دی ہیں۔

ان میں ایک کثیر تعداد ایسے واعظوں کی ہے جو غیبی حقائق کی نت نئی تاریکیوں اور عملی زندگی سے دُور کے نکاتِ لطیف کی موشگافیوں، بے اصل قصے کہانیوں، اور بے تکی من گھڑت روایات کو زبان پر لا کر عوام کو مبہوت کرتے رہتے ہیں۔ کم سے کم میری تو بدنصیبی یہ ہے کہ میں نے متعدد ایسی مسجدوں میں جمعہ کی نمازیں پڑھتے ہوئے اور دینی تقاریب کے محلہ وار جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے کبھی کوئی تقریر ایسی نہیں سُنی جس میں مسلمانوں کی باہمی محبت، صفائی اور شائستگی، خدمتِ خلق، رزقِ حرام سے اجتناب، طرح طرح کے جرائم کے خاتمے تقریبات میں اسراف اور رسومِ بد کے ازالے اور اس طرح کے دوسرے اصلاحی موضوعات کو لیا گیا ہو۔ ملک کے اہم اضطراب انگیز مسائل کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ نت نئے اُٹھتے لادینی نظریوں

اور انحرافی فتنوں پر کوئی بحث نہیں ہوتی ــــــ اور اگر کہیں کوئی جزوی تذکرہ ایسا آ بھی جائے تو وہ مؤثر دلائل سے خالی اور جذباتی زورِ بیاں کی وجہ سے بے نتیجہ رہتا ہے۔ اچھی سے اچھی باتیں مضحکہ بن جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ پڑھا لکھا طبقہ، خصوصاً نوجوان ایسی تقریروں کو سُن کر سرے سے دینی دلچسپی ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان سارے نتائج کا حساب علماء اور ائمہ اور واعظین کو آخرت میں دینا ہوگا۔

پھر لاؤڈ اسپیکر کا وہ بے محابا اور بے رحمانہ استعمال کہ نہ محلے کے بیماروں کا لحاظ، نہ تھکے اور کمزور لوگوں کی نیند کا پاس، نہ طالب علموں کی پڑھائی کی رعایت، نہ لکھنے پڑھنے والوں کے مشاغل کی اہمیت کا احساس، ــــــ بس آواز کا ایک طوفانی دریا ہے جو آس پاس کے گھروں میں انڈیلا جا رہا ہوتا ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ دین کا ایک مستقل ادنیٰ خادم ہونے ہوئے بھی مجھے جب کبھی لاؤڈ اسپیکر کی بوچھاڑ کا نشانہ بننا پڑتا ہے تو میرے اندر سخت بددلی پیدا ہوتی ہے۔ پھر لاؤڈ اسپیکروں کا مقابلہ ایک مزید آفت ہے۔ ایک مسجد کے مقابل کی دوسری مسجد میں زیادہ طاقت ور لاؤڈ اسپیکر نصب کیا جائے گا۔ پھر پہلے والی مسجد میں اس کی فکر شروع ہو جائے گی کہ آواز کی جنگ میں فتح ہماری ہونی چاہیے۔ تماشا یہ ہے کہ بسا اوقات مسجد کے اندر دس بیس آدمی موجود ہوتے ہیں۔ مگر لاؤڈ اسپیکر کے شور کا وہ طوفان اُمڈ رہا ہوتا ہے کہ سننے والا گمان کرتا ہے کہ ہزاروں کی حاضری ہوگی۔ اس طرح خلقِ خدا کو خدا کا نام لے کر اذیت دینا کوئی نیکی نہیں ہے۔ صرف اذان کے لیے بیرونی لاؤڈ اسپیکر استعمال ہونے چاہئیں۔ بقیہ تمام کاموں کے لیے مسجد کے اندر محدود آواز دینے والے لاؤڈ اسپیکر کام میں لائے جانے چاہئیں۔ خدا کے گھر سے جو کام بھی کیا جائے۔ اس میں شرافت و شائستگی کے تمام پہلو ملحوظ رکھنے چاہئیں، ورنہ ہر کوتاہ کاری کا حساب مذہبی عناصر کے مجموعی کھاتے میں درج ہو جاتا ہے۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ "جی یہ لوگ ایسے اور ایسے ہیں۔"

اس ناگزیر تجزیاتی اور تنقیدی گفتگو پر معذرت خواہی کے ساتھ ایک بار پھر ہم علماء کی خدمت میں بصد ادب و احترام یہ التماس کرنا چاہتے ہیں کہ براہ کرم اپنی قوم کے افکار اور کردار کی تعمیر اس طرح کیجیے کہ یہ کسی بھی آزمائش کے لمحے میں مضبوط ثابت ہو۔

معاشی طور پر جس معاشرے میں محرومیاں، ناہمواریاں، دکھ درد اور گلے شکوے پائے جاتے ہوں، وہ جارحیت کاروں کے لیے مضبوط قلعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ان سب سے بڑی بلائے بے درمان جاگیرداری اور وڈیرہ ازم ہے۔ دو بار "زرعی اصلاحات" کا شور ہوا، مگر کوئی مرد کار یا گروہِ عزیمت مند ایسا نمودار نہ ہوا جو اس قوتِ غارت گر کے گڑے ہوئے پنجوں کو معاشرے کی گردن سے الگ کرا سکے۔ جاگیردار اور وڈیرے ایک طرف [illegible] پال رکھتے ہیں اور جرم و جفا کا ہنگامہ گرم رکھتے ہیں، پھر اپنی اس تخریبی قوت کے ساتھ اپنی دولت کے زور کو ملا کر خوشامدانہ انداز سے ارباب جاہ کو رام کرتے ہیں۔ ا[illegible] باقی سب بیوروکریسی، سو اپنے دوسرے رسوخ کے ذریعے ان کو ایسے ذاتی ملازمین میں بدل لیتے ہیں جو ان کے اشارہ ابرو پر حکومت کے قوانین، ضوابط، مقاصد اور منصوبوں کا بھی حلیہ بگاڑتے ہیں اور عوام کو بھی ان کے سامنے کالانعام بنا دیتے ہیں۔ پھر ان جاگیرداروں وڈیروں کے الگ الگ جتھے بن جاتے ہیں۔ اور یہ جتھے آپس میں قوت آزمائی کرتے ہوئے زیروزبر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جاگیرداروں اور وڈیروں کا ایک بڑا حربہ یہ بھی ہے کہ یہ آس پاس کے مزاروں اور درگاہوں کو مرکز عقیدت بناتے ہیں۔ اور گدی نشینوں اور مجاوروں کا خوب پیٹ بھرتے ہیں۔ اپنے دائرہ اثر میں علماء دین (ہمارے چھوٹے چھوٹے خطیبوں اور اماموں) کو استعمال کرتے ہیں۔ ا[illegible] پوری طرح مسخر نہ ہوں ان کو نہ کھل کر کام کرنے کا موقع دیتے ہیں، نہ حق بات کہنے کا اذن۔ اس طرح جاگیرداریوں اور وڈیرہ ازم کی جابجا سلطنتیں (سلطنت در سلطنت) قائم ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ لوگ ووٹوں کی منڈی کے آڑھتی بن کر بیٹھتے ہیں اور یا تو خود انتخابات میں آتے ہیں یا اپنے مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اور اصلاح و تعمیر چاہنے والی ہر شریف و دیانت دار قوت کا راستہ مسدود کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں سیاست و جمہوریت کا حلیہ جس طرح بگڑا ہے اس میں بہت بڑا حصہ جاگیرداروں اور وڈیروں کا ہے۔ سندھ کی خرابیٔ احوال کی ذمہ داری خاصی بڑی حد تک ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے۔ اس سیاست بگاڑ، اخلاق شکن اور خیانت آموز قوت کا زور توڑے بغیر پاکستان صلاح و فلاح سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

اب یہ امر حیرت ناک ہے کہ منافع خوروں اور منصوبوں کے لیے اسی گروہ کو مزید زمینیں دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔ یعنی ہم لوگ "بر دوانِ لیشت بمنزل" بن گئے ہیں ۔

صنعت کا محاذ ہمارے ہاں مجموعی طور پر ابتدائی مرحلے میں ہے اور کمزور ہے ۔ چھوٹی چھوٹی صدہا اشیاء ایسی ہیں جو آسانی سے بن سکتی ہیں مگر ہم درآمد کرتے ہیں ۔ "پن اور سوئی تک کے معاملے میں ہم دوسروں کے محتاج ہیں ۔ پھر ملکی مصنوعات چند برس بھی قائم نہیں رہتا ، یہاں تک کہ خام اجناس کی طرح جو مصنوعات برآمد ہوتی ہیں وہ بھی پیسنی معیار دکھاتے ہوئے نمونے سے کمتر ہونے اور جعل سازی اور ملاوٹ کی وجہ سے وجہِ شکایت بنتی ہیں ۔ اور بیرونی منڈیوں کے دروازے ہم پر نہیں کھل سکتے ۔ درآمدی پہلو سے دیکھیں تو میک اپ کے سامان سے لے کر تعیشاتی مشینوں اور آرائشی سامانوں اور ٹیپوں ، تصویروں اور فلموں تک فضولیات کا ایک سیلاب چلا آرہا ہے ۔ جو ہمارے تمدنِ مبادلہ کی فصل کو مسلسل تباہ کرتا رہتا ہے ۔ مزید ستم یہ کہ خلافِ قانون اسمگلنگ کے کھلے اڈے بھی قائم ہیں اور خفیہ طور پر بھی پارچات ، الیکٹرانک کی مصنوعات اور گاڑیوں کے سپیئر پارٹس کئی کئی اطراف سے اسمگل ہو رہے ہیں ــــــ اور عین قانون کے سایے میں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نگاہوں کے سامنے ہو رہے ہیں ۔ ایسے میں درآمدی برآمدی تجارت میں اگر خسارہ ہو رہا ہو تو پیاز اور آلو برآمد کر کے اُسے کہاں تک پورا کیا جا سکتا ہے ۔

سودی معیشت کا دریا زور شور سے بہہ رہا ہے ، اس کے اندر ایک غیر سودی دھارا بھی رواں ہو گیا ہے ۔ آخر یہ کہاں تک غیر سودی ہو سکتا ہے ۔ ایک طرف سود جاری ہے ، دوسری طرف زکوٰۃ کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے ۔ یعنی ہمارے ہاں سرمایہ و دولت کے نظام میں اجتماعِ ضدین کا دلچسپ تماشہ سامنے ہے ۔

اِدھر ٹیکسوں کا بڑھتا ہوا بوجھ درمیانہ تنخواہ دار طبقے کی کمر توڑے دے رہا ہے [1] ۔

---

[1] اسی بجٹ کے سلسلے میں پٹرول ڈیزل کی قیمتوں کے اضافے کو عالمی تیل منڈی کے نرخوں کے تقابل میں دیکھیے ، پھر ذرا یہ یاد کیجیے کہ پانی کے نرخ بجائے تدریجاً بڑھانے کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

اِس سلسلے میں کبھی کسی سے معاشرتی حالات کا سروے کر کے نہیں دیکھا کہ اوسطاً کتنا کفالتی بوجھ ہر تنخواہ دار یا دکاندار کے سر ہے اور اس بوجھ کے ساتھ وہ لوگ بڑھتا ہوا ٹیکس ادا کر کے کن مشکلوں سے دوچار ہیں، جو اس شرافت کُش دور میں دینی و اخلاقی قدروں پر قائم ہیں۔ عالم بالا کے ماہرینِ حسابیات دفتروں میں بیٹھ کر بغیر سماجی حالات کو جانے اس طرح ٹیکس لگاتے چلے جاتے ہیں گویا اس سرزمین پر کچھ بے زبان لدو مویشی بستے ہیں کہ اُن پر نت نیا بوجھ ڈالتے چلے جاؤ یہاں تک کہ وہ فاقہ کشی کی وجہ سے سوکھ سوکھ کر دم توڑ دیں۔ یہ رویّہ تو کا ہوتا ہے کسی حکومت کے کارپردازوں کا نہیں جو ساری آبادی کے لیے مائی باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عہدہ داروں اور افسروں کے طبقۂ اعلیٰ کی بھاری تنخواہیں اور وسیع مراعات (جن میں غیر ملکی سفر کرنا اور اعلیٰ پیمانے کے آپریشنوں اور علاجوں سے استفادہ کرنا بھی شامل ہے) اور ان کے ساتھ ملکی وسائل سے ناجائز استفادہ کی صورتیں نیز رشوت کی کمائیاں مل جل کر معاشی اُلجھن کو اور پیچیدہ کر دیتی ہیں۔

ایک مسئلہ غیر ممالک میں جانے والے پاکستانیوں کے کمائے ہوئے زرمبادلہ کا ہے۔ جہاں یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ اِس ذریعۂ آمدنی نے ہمارے نظامِ مالیات کو بڑا سہارا دے رکھا ہے، وہاں ایک پہلو سامانِ اضطراب بھی ہے۔ بیرونی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ تفریح و تعیش کے جدید مہنگے سامانوں اور قیمتی پارچات کی نذر ہوتا رہتا ہے۔ اور دوسرا بڑا حصّہ زمینیں اور پلاٹ خریدنے اور مکان بنانے پر خرچ ہوتا ہے علاوہ ازیں باہر جا کر کام کرنے والوں کے گھروں اور خاندانوں کا معیارِ زندگی بلحاظ اوسط

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ایک بار دو گنے کیے، پھر دوسری بار دُگنے کیے گئے اور پھر تیسری بار دُگنے کر دیے۔ بجلی کے نرخوں کا بھی سال وار گوشوارہ غور سے ملاحظہ کیجیے۔ آخر یہ کیسی رعایا پروری ہے۔ حکومت کو وہ انداز نہیں سجتے جو اجارہ دارانہ حیثیت کے بل پر نفع پرست صناع یا تاجر اختیار کرتے ہیں۔

تقریباً ۱:۷ کی نسبت سے زیادہ بلند ہے۔ ان گھروں نے مارکیٹ میں بڑے پیمانے پر مہنگی سے مہنگی خریداری کر کے قیمتوں کو بلند تر کرنے میں حصہ لیا ہے۔ اس طرح متوسط سطح کے ملازمت پیشہ شرفا کے لیے زندگی کی مسابقت جان لیوا ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ اب شادیوں کے لیے ایک مؤثر کوالیفکیشن یہ ہو گئی ہے کہ "لڑکا باہر کام کرتا ہے"۔ عورتوں کی مجلسوں میں نگاہ اس بات پر رہتی ہے کہ خاتون نے اور اس کے بچوں نے باہر کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔

اس بیرونی آمدنی کو اگر شروع سے انضباط میں لیا جاتا اور اس کا کچھ فیصد نقد کسی قومی فنڈ کے ذریعے صنعت و تجارت کے ایسے کاموں میں لگایا جاتا کہ باہر جانے والوں کو جب واپس آنا پڑتا[1] تو انہیں یہاں کوئی مناسب کام مل جاتا تو یہ بصیرت مندی اپنی برکات دکھاتی۔ مگر اب جس طرح "کھوہ کی مٹی کھوہ" لگتی رہتی ہے، اس کا نتیجہ جلدی پریشانی کا سبب بنے گا۔

اوپر سے غیر ملکی قرضے ہیں جن کی ہم پر اس طرح تہیں چڑھتی جا رہی ہیں جیسے صحرا میں بگولوں کے ساتھ اڑتی ریت کی تہیں ٹیلوں اور سنگپاروں پر چڑھتی رہتی ہیں۔ ہم قرض لیتے ہیں، پھر قرض کا سود ادا کرنے کے لیے مزید قرض لیتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے۔

ہمارے معاشی و مالیاتی نظام کی کمزوری کا ایک سبب کسی نمائندہ ایوان میں بجٹ کا پاس نہ ہونا ہوتا ہے۔ اگر کسی ذمہ دار انتظامیہ کے وزیر خزانہ کا بنایا ہوا بجٹ طے ہوتا اور وہ باقاعدہ کسی نمائندہ ایوان میں زیر بحث آتا تو اس کے پُراسرار پہلو نمایاں ہو جاتے اور اس کے کمزور پہلوؤں کی درستی ممکن ہوتی۔ اب تو بجٹ ایک شخص کا بنایا ہوا ہوتا ہے جس

---

[1] یہ واپسی اب مشرق وسطیٰ سے شروع ہو گئی ہے کیونکہ ایران عراق جنگ نے خلیجی ریاستوں کے اقتصادی حالات پر بُرا اثر ڈال دیا ہے۔ کسی بھی دوسرے مغربی ملک کے حالات اچانک ایسا رُخ اختیار کر سکتے ہیں کہ وہاں سے ہمارے کارکنوں کو واپس آنا پڑے۔ اگر ان کے لیے کوئی انتظام نہ ہوا تو بے روزگاروں کی ایک بڑی تعداد ملک کے حالات پر اثرات ڈالے گی۔

کی جھلک مارشل لا اور بیوروکریسی کے چند افراد کی مجلس کو دکھائی جاتی ہے، اور پھر اس پر مُہرِ نفاذ لگ جاتی ہے۔ نہ اخباروں میں بحثیں، نہ اسٹیجوں سے کوئی ردّ و قدح۔ اور تو اور حکومت کی اپنی مرتب کردہ مجلسِ شوریٰ کے سامنے بھی وہ تبرکاً پیش ہوتا ہے، اس میں یہ مصنوعی ایوان بھی کوئی ادنیٰ تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔

اِن حالات میں ہمارے ہاں بے روزگاری بھی ہے اور کفالتی سطح سے بہت نیچے کی آمدنیوں کی وجہ سے غربت کی شدید اذیتیں بھی ہیں۔ غور فرمایئے کہ متوسط طبقے کے نچلے حصے سے تعلق رکھنے والے جن افراد کو اپنے کنبے کی کفالت کے لیے دو ہزار سے نیچے کی آمدنی ہوتی ہے وہ کرایۂ مکان ادا کرنے کے بعد چار پانچ افراد کی ضروریات کیسے پوری کرتے ہوں گے۔ اور حال یہ ہے کہ اس سطح کے بے شمار افراد کی آمدنیاں ہزار بارہ سو سے زائد نہیں۔ اب جن کی آمدنیاں ہزار سے بھی کم ہوں، اُن کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اور پھر غریب طبقہ کو لیجیے جسے ۲، ۳ یا ۴ سو ماہانہ ملتا ہے۔ اس معاشی دباؤ نے رشوت اور خیانت کے روگ کو تیزی سے بڑھانے میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ ایسی ہی محرومیوں نے سندھ اور دوسرے علاقوں میں بڑی تلخیاں پیدا کر دی ہیں۔

اِن حالات میں کسی جارحیت کا مقابلہ کرنا پڑ جائے تو بڑی سنگین آزمائش ہوگی۔ قوم کے حکمرانوں، سیاسی اور دینی قائدین، ماہرینِ معاشیات و مالیات کو ایک تیز رفتار نقشۂ کار کے تحت چند ایسے موثر انقلابی اقدامات کرنے چاہییں کہ غریبی اور محرومی کے دُکھ سے لوگ نجات پاسکیں اور طبقاتی ناہمواریوں کا خاتمہ ہو جائے۔

قوتِ دفاع پر اثر انداز ہونے والا ایک عامل کسی قوم کا ثقافتی اسلوب بھی ہے۔ اگر یہ اسلوب پہلے سے جنسیت انگیز، فحش، تعیش پسندانہ ہو تو وہ عوام کے ذہنوں کو اعلیٰ مقاصد کے لیے قربانیاں دینے سے دُور ہٹاتا ہے۔ پھر خصوصاً اس صورت میں جب کہ ثقافتی اسلوب بنیادی عقاید و تصورات اور اخلاقی اقدار سے ٹکراتا ہو تو یہ تضاد بڑا خطرناک روگ ثابت

ہوتا ہے۔

اور ساری باتیں الگ رکھ کر سوچیے کہ آیا ہماری ثقافت عین وہی ہے جو بھارت، اسرائیل، روس اور امریکہ کی ہے، کیا ہمارے ثقافتی نشوونما ارتقاء کا رنگ وہی ہوگا جو کسی ملحد اور مادہ پرست سوسائٹی کا ہوتا ہے جس میں نہ کوئی دینی حدود و قیود ہوں، نہ صنفین کے اختلاطِ عام سے پرہیز، نہ لہو و لعب سے اجتناب، نہ اسراف و تبذیر پر بندش، نہ روحِ حیا کے تحفظ کے لیے نظامِ حجاب اور نہ خدا پرستی اور امرِ اخروی جوابدہی کا کوئی احساس کارفرما ہو؟

ہمارے ہاں ثقافتی نشوونما غلام محمد کے دور سے لے کر ایوب خانی دور تک اور یحییٰ خاں کے زمانہ اقتدار سے لے کر پیپلز پارٹی کے عہد تک (بلکہ اس کے بعد بھی) ٹھیک ان ہی خطوط پر ہوتا چلا آرہا ہے جو مغرب کی لادین تہذیب کے مقرر کردہ ہیں۔ اور جن کو سامراجی طاقتیں مسلمان معاشروں میں اس مقصد سے پھیلانے پر تلی ہوئی ہیں کہ اس رنگین و دلفریب راستے سے اسلام کو ایک فعال تاریخی قوت بننے سے روکا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ صیادانِ مغرب کے اقبال کا ایسا جادو ہم پر طاری ہے کہ ہم اُن کے پھینکے ہوئے جال کے حلقے اپنی ہی منقاروں سے کس رہے ہیں۔ ہمیں لفظِ ترقی کے جو معانی دوسروں نے طے کر کے دیئے ہیں اُن میں چند دوسری چیزوں کے علاوہ مخالفِ اسلام ثقافت کا فروغ بھی شامل ہے۔ تہذیبِ جدید کے لغت کے خلاف بغاوت تو کجا، ذرا سی جرأتِ اختلاف بھی نہیں ہے کہ کچھ تو فرق واقع ہو جائے۔ اسی حالت کا نام ثقافتی غلامی ہے اور یہ غلامی فکر و کردار دونوں کو کمزور کرتی ہے۔ قرآن و حدیث کچھ اور کہتے ہیں اور ثقافت کسی اور طرف لے جا رہی ہے۔

اُن گزرے ہوئے واقعات کو تو چھوڑیئے کہ بعض قومی اکابر نے شادیوں کی تقاریب کے موقع پر شراب و رباب کے ہنگامے برپا کیے اور ان سے ایسے لوگ بھی محفوظ نہ رہے جن کا منصب ایسی حرکات کی روک تھام کرنا ہے۔ تازہ احوال یہ ہیں کہ "جمعیت" کا گلا گھونٹنے کے بعد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ڈرامیٹک کلب اور میوزک سوسائٹیاں قائم ہو گئی ہیں، جن کے اسٹیجوں پر ثقافت نے ناچنا گانا شروع کر دیا ہے۔

انہی دنوں اسلام آباد میں، جہاں نفاذِ اسلام کی علمبردار شخصیت مسندِ صدارت پر متمکن ہے، ٹیبل ٹینس چیمپئن شپ کا انعقاد ہوا۔ جس میں باہر اور اندر کی عورتوں کی ٹیموں نے حصہ لیا۔ باہر والیاں تو ترقی کی راہ پر کافی آگے جا چکی ہیں اس لیے انہوں نے نیکروں میں جلوہ افشانی اور اعضا جنبانی کے مناظر دکھا کر پاکستانی عورتوں کی رہنمائی کی۔ خود پاکستانی عورتیں ابھی تو قمیص شلوار کے ساتھ شریک ہوئیں مگر آخر بدن کی بڑھتی ہوئی قوت لباسوں کو تار تار کر کے رہے گی۔ اِن کھیلوں کے مناظر ٹیلی وژن پر دکھا دکھا کر دکھائے گئے، تاکہ پورے پاکستان کے مرد و زن، طالبان و طالباتِ علم اور بچے بچیاں "ثواب" سے محروم نہ رہ جائیں۔ ان مناظر کے خلاف بعض اخلاقی احساس رکھنے والوں نے احتجاجی مراسلے بھی لکھے، مگر ترقی کا طوفان احتجاجوں سے کہاں رکتا ہے۔ یہاں وزیروں سے لے کر میئروں تک کوئی بھی نہیں جو یہ آواز اٹھا سکتا کہ ہم امتِ محمدیہ کو ایسے مظاہروں سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔ افکار کے آگے آگے ماڈرن خواتین، پیچھے لادینیت پسند اور اشتراکی عناصر جو نفاذِ شریعت کے علاوہ بیانوں ہی پر سیخ پا ہیں ـــــ ایسے نقشۂ جنگ کے ہوتے ہوئے تنہا صدرِ پاکستان کی مشکل ظاہر ہے۔

چند روز پہلے کی خبر ہے کہ گوجرانوالہ میں بہت بڑا ثقافتی مرکز کھولا جا رہا ہے جس میں مردوں عورتوں کو ایکٹنگ کی تربیت دی جائے گی، جس میں رقص و سرود تو شامل ہونا ہی ہے۔ اس سنٹر میں رنگا رنگ تقاریب اور ڈرامے ہوا کریں گے۔ اُدھر اُدھر نفاذِ شریعت اپنی جگہ جاری رہے گا۔

پنجاب کی صوبائی مجلس کونسل میں قریباً ایک ہفتہ پہلے اجلاس کی کارروائی شروع ہونے سے قبل ایجنڈے (سوالات کے جوابات) سے ہٹ کر تنویر گلشن مرزا نے بطورِ خاص کچھ کہنے کی اجازت حاصل کی۔ انہوں نے نہایت دکھ اور کرب کے ساتھ یہ شکایت کی کہ رات ڈرامے کے نام سے جو کچھ دکھایا گیا ہے اس کو بھانڈ پن کہنے سے بھی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ انہوں نے اس پروگرام کو فضول اور لچر قرار دیا ہے۔ معلوم رہے کہ یہ پروگرام سرکاری انتظام سے دکھایا گیا تھا۔ اس کے لچر پن کے خلاف متذکرہ حساس خاتون آواز اٹھائے بغیر رہ نہ سکیں

لیکن ان کی تقریر کے وقت سناٹا تو چھایا رہا مگر کسی نے نہ کوئی وضاحت کی، نہ معذرت۔

کیا کوئی قوت نوٹس لینے والی ہے جو معلوم کرے کہ کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا، اور کس کے ایما پر ہوا؟

تعلیم گاہوں میں نوعمر اور نوجوان طالبات کے مختلف قسم کے شو ہوتے ہیں۔ ان کے لیے گویا لازمی ہے کہ کوئی مرد وزیر یا افسر اپنا سایۂ شفقت فراہم کرے۔ آخر کیوں؟ اس روش کی سندِ جواز کس شریعت سے لی گئی ہے؟

ویگنوں (اور بسوں اور ٹرکوں) میں موسیقی کے کیسٹ ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ ڈرائیور اکثر آواز بہت اونچی رکھتے ہیں۔ اور چھ چھ گھنٹے کے سفر میں یہ عذاب مسافروں خصوصاً خواتین کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کچھ مسافر ایسے ہوتے ہیں جو سرے سے موسیقی کو حرام سمجھتے ہیں، کچھ وہ جو نشر ہونے والے واہیات فلمی گانوں کی فحش پن سے اذیت اٹھاتے ہیں۔ بقیہ بھی شورِ مسلسل کی وجہ سے بدمزہ ہوتے ہیں۔ اور خواتین اور نوجوان لڑکیاں دل ہی دل میں کٹ رہی ہوتی ہیں۔ مگر کون ہے جو بندگانِ خدا کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔

قانون بھی موجود ہے، قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ان کے کارکن بھی، مگر بسوں اور ویگنوں کے اندر امنڈنے والے اس طوفانِ ثقافت کو آج تک کوئی نہیں روک سکا حتیٰ کہ مارشل لا بھی دم بخود ہے۔ کیا کوئی ہے جو اس چیلنج کا سامنا کرے؟

انتخابات کے حوالے سے شناختی کارڈوں پر عورتوں کی تصویر کو لازم قرار دے کر گویا ہر پردہ نشین عورت کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اگر ملک کے سیاسی دروبست میں ووٹ کے ذریعے حصہ لینا چاہے تو اپنا چہرہ نہ صرف فوٹوگرافر کے سامنے کھولے بلکہ پریذائیڈنگ آفیسر، پولنگ آفیسر اور پولنگ ایجنٹس کے سامنے بھی چہرہ نمائی کرے تاکہ اس کی صورت کو تصویر سے ملا کر دیکھا جا سکے۔ جہاں تک اس معاملے میں دلائل کا تعلق ہے، ہم گذشتہ شمارے میں تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔ مگر بے بسی یہ ہے کہ دلیل کو قوت کے سامنے وزن حاصل نہیں ہے۔

وڈیو کیسٹس کے متعلق بارہا اخبارات میں مراسلات اور ادارتی نوٹ آتے رہے ہیں اس وقت میرے سامنے اس مذاکرے کی روداد کا خلاصہ ہے، جو ایوانِ وقت کراچی کے

زیر اہتمام فلمی شخصیتوں کے درمیان ہوا - اور جس کی روئیداد نوائے وقت لاہور نے مورخہ ۲۱ راکتوبر کی اشاعت میں صفحہ نمبر ۵ کے ابتدائی تین کالموں میں چھاپی ہے -

ہذا کرے میں کہا گیا ہے کہ "نئی نسل کو گمراہ کرنے والی مخرب اخلاق بھارتی فحش انگریزی فلموں کی عام نمائش کی روک تھام کی جائے" ڈاکٹر بشیر احمد ججرہ نے "ملک میں فحاشی کی روک تھام اور نئی نسل میں اخلاقی بے راہ روی پھیلانے والی وڈیو کیسٹ کے خلاف ہر مہم میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا" پاکستان ڈسٹری بیوٹرز ایسوسی ایشن کے صدر ستیش چندر آنند نے کہا کہ "وی سی آر کے کمرشل لائسنس کی آڑ میں جھونپڑیوں اور قہوہ خانوں میں غیر قانونی سینما گھر قائم ہو گئے ہیں" - حاجی محمد حنیف نے کہا کہ "گھر گھر فحاشی پھیلائی جا رہی ہے" عبدالباسط (یہ نام غلط چھپا ہوا ہے، معلوم نہیں صحیح کیا ہے!) نے کہا کہ "شہر میں چلنے والی وڈیو کی بیشتر دکانیں پولیس والوں کو بھتہ دیتی ہیں" لیاقت علی نے کہا کہ "ٹیکس ادا کرنے والوں کے لیے سنسر شپ کے سخت قوانین ہیں، جب کہ وڈیو پر غیر قانونی طریقے سے فلموں کا کاروبار کرنے والے ہر قانون سے بالاتر ہیں" -

وڈیو کیسٹوں پر میری بالواسطہ معلومات کے مطابق ایسی منحوس بلیو فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں جن کے مناظر دیکھنے والوں کے ذہن میں گندے خیالوں اور جذبوں کی ایسی میخیں گرد جاتی ہیں جو اُن کو طہارتِ فکر و نظر سے محروم کر دیتی ہیں -

اِدھر ٹیلی وژن پر جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں وہ بھی گھروں کے اندر نہایت بُرے اثرات ڈالتی ہیں - ٹیلی وژن کے اپنے پروگراموں میں بھی بہت سی چیزیں سخت قابلِ اعتراض ہوتی ہیں - اشتہارات کے پردے میں تو جان بوجھ کر لغویات کو اُبھارا جاتا ہے ٹیلی وژن سے اعلان کرنے والیوں، خبریں سُنانے والیوں کو تو صدارتی حکم نے آنچل اوڑھوا دیئے (اگرچہ سر کے سامنے کا حصہ ابھی تک باقی ہے) مگر ڈراموں میں آنے والی عورتوں کو پورا استثنیٰ حاصل ہے - پھر کتنے ہی معمول کے متوسط پروگرام ہیں جن میں مزامیر کی آوازیں

لہ میرے خیال میں ایسی فلموں کو پاس رکھنا اور اُن کی خرید و فروخت کرنا بھی ممنوع ہونا چاہیے۔

خوش کہ بہت سے ایسے لوگوں کو مستقلاً ٹیلی ویژن سے پیچھے رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے جو چنگ و رباب اور طبلہ و ستار کی آوازوں کو اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے۔ حالانکہ موسیقی اور مزامیر کے پروگرام الگ رکھے جا سکتے ہیں، جنہیں جو نہ سُننا چاہے وہ نہ سُنے۔

اس ثقافتی نشوونما کو ایک طرف راجہ ظفر الحق بہتری کے رُخ پر ڈالنے کی کوشش رہتے ہیں اور دوسری طرف ویمن ڈویژن کی سربراہ سلیمہ احمد رشی کو دوسری طرف کھینچتی ہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں فرمایا کہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ ملاؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ آخر عورت تو رُوحِ ثقافت ٹھہری۔ اس کا اثر تو جادو گرانہ ہونا ہے: سوال یہ ہے کہ کن اسباب کے تحت نفاذِ شریعت اور احیائے اسلام کے دوران میں ایسے لوگوں کو کارپردازوں میں شامل کیا جائے جن کا سمتِ اقدام دوسری طرف ہو۔

کاشکہ اب مشکل حالات کو سامنے دیکھ کر اور خدا کی کسی اچانک گرفت سے ڈر کر ثقافتی سفر کا رُخ درست کر لیا جائے۔

احیائے اسلام یا نفاذِ شریعت ایسا مبارک کام ہے جو گئے گزرے مسلمانوں میں بھی زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتا ہے۔ ابھی تازہ واقعہ ہے کہ مغربی سوڈان جو تین چار سال سے قحط اور خشک سالی کا شکار رہا ہے اور اس وجہ سے اکابرِ حکومت اُدھر کا دورہ کرنے کی بھی جرأت نہیں کرتے، اچانک صدر نمیری جو اس وقت نفاذِ شریعت کی مؤثر تیز رفتار مہم چلا رہے ہیں۔ وہاں دورے کے لیے جا پہنچے۔ وہاں کے لوگوں نے اُن سے کہا کہ آپ اسلام کو جاری کریں، ہم یہ فقر و فاقہ صبر و شکر سے بھگت لیں گے۔ نفاذِ اسلام سے تو ایسے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور یہی جذبات دفاعی قوت کو بڑھا دیتے ہیں۔

غلبہ اسلام اور نفاذِ شریعت کے لیے جو عزم ہمارے یہاں ظاہر کیا گیا ہے اور اس کے زیرِ اثر بعض اقدامات بھی ہوئے ہیں، ہزار بار مبارک! مگر غلبۂ اسلام اور نفاذِ شریعت کے لیے چند اصولی خطوطِ کار ہیں، جن کو اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو افکار پراگندہ ہونے لگتے ہیں اور اعمال متضاد

پہلی ضروری بات یہ ہے کہ اسلام کے چند متفرق اجزا کو ایک ایک کر کے وقتاً فوقتاً نافذ کرنے کا اعلان کرنے کے بجائے جامع منصوبہ بندی کر کے ہر شعبہ کا رکے لیے ترجیحات اور مراحل طے کیے جانے چاہئیں۔ اور پھر سارا کام تین یا پانچ سالہ منصوبے کے مطابق مقررہ وقت میں مکمل کر دینا چاہیے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کسی بھی اسلامی قانون یا قاعدۂ امر و نہی کو نافذ کرنے سے پہلے ایسے ماہرینِ علومِ اسلامی و علمائے قانونِ شریعت کی مناسب تعداد کے ذریعے متعین و مدوّن کر دیا جائے جن کے علم اور کردار پر ان کی سابق خدمات کی بنا پر عوام میں بھروسہ پایا جاتا ہو۔ قربِ اہلِ جاہ کے نئے نئے طالبوں، شہرت کے دلدادوں یا مفاد کے حریصوں کو اس طرف کا راستہ نہیں ملنا چاہیے۔

یہ طریقہ بھی عوام کو شرحِ صدر سے محروم کر دیتا ہے کہ پہلے ایک وقیع ادارہ بنایا جائے، پھر اس کی کوئی بات پسند نہ آئے یا اس سے کوئی مطلوبہ رائے حاصل نہ کی جا سکے تو مقابل میں ایک دوسرا انتظام تشکیل دے لیا جائے۔ پھر ضرورت ہو تو تیسرا اور چوتھا۔ یہاں تک کہ پسند کا نقطۂ نظر مل جائے یا ملکی ادارات کا توڑ کرنے کے لیے غیر ملکی شخصیتوں اور اداروں سے استفادہ کیا جائے یا کبھی سربراہانِ ادارات کی تبدیلی کا سہارا لیا جائے۔ ان حالات میں یک سوئی سے گامزنی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ سفر منحنی خطوط میں ہوتا ہے، اور اہلِ علم میں بحثا بحثی اور عوام میں انتشار پھیل جاتا ہے۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ شریعت کا کوئی حکم ایسی حالت میں نافذ نہ کرنا چاہیے جب کہ اس سے ٹکرانے والا ایک حکم موجود ہو۔ مثلاً نکاح اور زنا دونوں کو ساتھ ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ سود اور زکوٰۃ متوازی طور پر جاری نہیں رہ سکتے۔ پردے کے اسلامی تصورات اور مغرب کا تصورِ ترقی نسواں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ ایسے تضاد اگر پیدا کر دیے جائیں تو نفاذِ شریعت کا کوئی اقدام ایک مذاق بن کر رہ جائے گا اور اس کی خیر و خوبی کالعدم ہو جائے گی۔

چوتھی ضروری بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے کارپردازوں کی ایک ایسی مضبوط ٹیم تیار کی جائے (؟) جو اوپر

موجود ہونی چاہیے جس کے تمام افراد سچے دل سے اسلام کے محب، وفادار اور اس کے اجرا و نفاذ کے لیے بے تاب ہوں۔ خود ان میں اگر ترنگا پن یا پچر نگی موجود ہو تو نتائج اطمینان بخش نہیں ہو سکتے۔

مردانِ کار ہی کے سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ تمام اہم سرکاری محکموں اور شعبہ ہائے کار پر صحیح الایمان اور صحیح الفکر افراد فائز کیے جائیں۔ جہاں کہیں کوئی الحاد پسند، کوئی اشتراکی الفکر، کوئی حامیٔ لادینیت، کوئی قادیانی، کوئی مغرب پرست، کوئی مریضِ علاقائیت بیٹھا ہو، اُسے راستے سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا جائے۔ بدقسمتی سے اس پہلو سے حالات کبھی سازگار نہ تھے۔ اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، خرابیٔ احوال بڑھتی گئی۔ چوروں سے پہرہ داری کا کام لینے کا تجربہ حسب دلخواہ نتائج نہیں دکھا سکتا۔ علی الخصوص ایسے لوگ جو احکامِ نفاذِ شریعت کا مذاق اُڑانے والے ہوں، جو اس پورے کام کو ناپسندیدہ اور قدامت پسندانہ سمجھتے ہوں، جو نظریاتی و اعتقادی طور پر اس کے مخالف ہوں، ان کی طرف سے جب کبھی کوئی مزاحمانہ قول یا فعل سامنے آئے تو انہیں فوراً ضابطے کے شکنجے میں کس کر نمونۂ عبرت بنا دینا چاہیے۔

پانچویں ضرورت یہ کہ اگر نفاذِ شریعت کے سلسلے میں کسی حکم پر عمل درآمد نہ ہو رہا ہو اور سرکاری ملازمین یا عوام میں سرد مہری پائی جائے تو اولاً متعلقہ افسران سے جواب طلبی کی جائے، بعدہٗ اگر ضرورت ہو تو تحقیقاتی کارروائی کر کے معلوم کیا جائے کہ پانی کہاں مرتا ہے۔

چھٹی ضرورت یہ ہے کہ ایسی عوامی جماعتیں یا تنظیمیں ہونی چاہییں جو اوپر کے احکام کو عوام تک دلائل کے ساتھ ترغیبی انداز سے پہنچائیں اور ان میں فرداً فرداً بھی اور محلے محلے، بستی بستی میں بھی اصلاح پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دوسری طرف ان کی یہ ذمہ داری از خود ہوگی کہ وہ اوپر والوں کو آگاہ کریں کہ کون کہاں مزاحمت کر رہا ہے یا منفی انداز کے اثرات ڈال رہا ہے، یا اپنے فرض سے دانستہ غفلت برت رہا ہے، نیز خود شہریوں کو کسی معاملے میں کیا شکایات، اعتراضات یا تکالیف ہیں۔

ساتویں ضرورت یہ ہے کہ جمہوری ادارات موجود ہوں، اوپر وفاقی پارلیمنٹ بیٹھی ہو

اور وہ اسلامی نظریاتی کونسل یا ایسے کسی بھی ادارے سے اس کے مسودہ ہائے قانون یا اس کے قانونی خاکوں کے مطابق مسودے تیار کرا کے انہیں پاس کرے اور پھر ان کے نفاذ کی کڑی نگرانی بھی کرے۔ ایسی جمہوری فضا کے بغیر محض مارشل لا کے بل پر نافذ شدہ قوانین و احکام زیادہ عرصہ تک کے لیے وقعت حاصل نہیں کر سکتے۔

موجودہ صورت کے بجائے اگر اس خاکے کے مطابق کام کیا جائے تو عوام میں ایک نیا شعور اُبھرے گا، اپنے جداگانہ تشخص کا احساس پیدا ہوگا۔ پاکستان کی اصل معنویت ان کی سمجھ میں آئے گی۔ اور اسلامی زندگی کی برکات ان کو نصیب ہوں گی۔ حالات کی یہ تبدیلی ان میں تحفظ پاکستان کا نیا ولولہ پیدا کرے گی اور وہ اس سرزمین کی حفاظت محض وطن ہونے کی بنا پر ہی نہیں، بلکہ اس داعیے سے کریں گے کہ اس سرزمین پر اسلام جلوہ گر ہو رہا ہے اور یہ وطن خدا اور رسولؐ کی شریعت کے لیے وقف ہے۔

زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تحفظ پاکستان کی حقیقی قوت عوام میں پیدا کرنے کے لیے یہ تھیں وہ ضروری گذارشات جو عرض کر دی گئیں۔ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے اور جو جو باتیں درست معلوم ہوں اُن کو قبول کیجیے۔

خدا ہم سب کو راہ ہدایت پر چلائے۔ ہمیں اتحاد دے، جذبہ اخوت دے، ولولۂ جہاد دے اور تحفظ پاکستان کے لیے عزیمت و صلاحیت دے۔

خدا سے ہم عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ یارب! ہماری کوتاہ کاریوں اور بدعملیوں کی وجہ سے ہمیں گرفت میں نہ لیجیے اور کسی آزمائش میں نہ ڈالیے۔ جو دشمن قوتیں ہمارے اردگرد ہتھیار لیے کھڑی غرّا رہی ہیں اُن کو پیش دستی کی توفیق نہ دیجیے۔

اے احکم الحاکمین! اگر کوئی جارحیت پسند اور ظلم کیش قوت ہمارے خلاف اقدامِ بد کرے تو ہمیں اس کے کلّے توڑ دینے کے قابل بنائیے۔ آمین۔

مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف

"تفہیم القرآن"

کے مختلف موضوعات کو الگ الگ کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے فی الحال!

دُنیا

کے موضوع کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔ آئندہ آنے والے موضوعات: آخرت اور انسان ہیں۔

ہدیہ

پیپر بیک	:	۱۶/- روپے
آفسٹ پیپر ہارڈ باؤنڈ	:	۲۷/- "

تاجر حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر فوری طور پر رجوع فرمائیں۔ سٹاک محدود تعداد میں دستیاب ہے۔

براہِ راست منگوانے پر انفرادی خریداروں کو ایڈوانس بھیجنے پر ۵۰٪ کمیشن کے علاوہ پیکنگ مع ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

ملنے کا پتہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی فاؤنڈیشن ۱۶۶ ۔ نیو انارکلی لاہور
فون: ۳۲۱۹۶۰ - ۳۲۵۳۷۴ - ۶۸۶۳۳۶